بازار میں نیند
شمیم حنفی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی
Meer Zaheer Abass Rustmani

بازار میں نیند

ڈرامے

شمیم حنفی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

BAZAR MEN NEEND
BY
SHAMIM HANFI

سرورق: **پروفیسر محمد شہیر**

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025
شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار، جامع مسجد دہلی 110006
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنس بلڈنگ، ممبئی 400003
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ 202002

پہلی بار: ستمبر ۱۹۹۸ء تعداد: 500 قیمت =/75 روپے

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں طبع ہوئی

اَلنَّاسُ خِیَامٌ فَاِذَا مَاتُوا اِنْتَبَہُوا

لوگ سو رہے ہیں۔ جب مریں گے تو بیدار ہو جائیں گے

حضرت علیؓ

انعم، اوشی بابا، منیزہ اور سامیہ کے نام

ترتیب

پیش لفظ

بازار میں نیند میرے ڈراموں کا چوتھا مجموعہ ہے۔ ان میں ڈرامے کا عنصر بس اتنا ہی ہے جتنا کہ عام انسانوں کی زندگی میں ہو سکتا ہے۔ پتا نہیں کیوں، انہونی بات بھی انہونی نہیں لگتی۔ سب کچھ جانا پہچانا، ناگزیر اور توقع کے عین مطابق نظر آتا ہے۔

پچھلے ڈراموں کی طرح، یہ ڈرامے بھی کچھ جیتی جاگتی آنکھوں کا تجربہ ہیں، کچھ خوابوں کی صورت سامنے آئے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ زندگی کا وہ حصہ جو خوابوں میں بسر ہوا، کسی بھی طرح اس حصے سے کم گنجان اور وسیع نہیں ہے جس کا تعلق بیداری سے ہے۔ میرے لیے، خواب اور بیداری حواس پر گزرنے والی دو کیفیتیں کبھی نہیں رہیں۔ یہ دونوں حواس کے دو منطقے ہیں جن کے مابین ایک مضبوط رشتہ ہمیشہ استوار رہا۔ میں اپنی سوجھ بوجھ اور داخلی ضرورت کے مطابق ایک سے دوسرے منطقے میں برابر آتا جاتا رہتا ہوں۔

دنیا کو میں نے جس حد تک کھلی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس سے شاید کچھ زیادہ ہی بند آنکھوں سے دیکھتا رہا ہوں، شعوری اور غیر شعوری دونوں سطحوں پر۔ بھری پری، پُرشور، آباد اور بھیڑ سے چھلکتی ہوئی سڑکیں اور بازار، کبھی کبھی مجھے قبرستانوں سے زیادہ سنسان دکھائی دیے۔ یا پھر کچھ ایسا محسوس ہوا کہ یہ سارا تماشا کسی انجانے تنویمی عمل کے پھیر میں ہے۔ جو کچھ بظاہر آنکھوں کے سامنے ہے، اصلی اور حقیقی نہیں ہے۔ اسی طرح نیند کی حالت میں، خوابوں کے ساتھ آنکھوں پر جو منظر بے روشن ہوئے، اور جاگنے پر جنھیں ہم نے صرف گئی بیتی بات یا داہمہ سمجھ لیا تھا، دو بدو پیش آنے والے واقعات سے زیادہ گرم اور دھڑکتے ہوئے نکلے۔ ان کا اثر مدتوں باقی رہا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ خیالوں سے میری مڈبھیڑ

کرداروں کی جیسی ہوتی ہے۔ ان سے باقاعدہ مکالمہ ہوتا ہے۔ اور اس مکالمے کے دوران' میں اتفاق اور اختلاف کی اُن تمام صورتوں سے دوچار ہوتا ہوں جو جیتے جاگتے انسانوں اور ٹھوس چیزوں سے رابطے کے دوران نمودار ہوتی ہیں۔ خیال سے ٹکراؤ ویسا ہی سچ ہے جیسا کہ کسی شے یا شخص سے۔ میں نے غالباً اسی صورت حال کے باعث اپنے ڈرامے کے اختتام یا انجام کو زبردستی اور خواہ مخواہ موڑنے توڑنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ جس طرح زندگی کا کوئی بھی سلسلہ اچانک کہیں رک جاتا ہے، اسی طرح یہ ڈرامے بھی چلتے چلتے ٹھہر جاتے ہیں۔ بعض اوقات ایک ڈرامے کا سلسلہ کسی دوسرے ڈرامے سے جا ملتا ہے۔ انھیں پڑھتے وقت آپ یہی دیکھیں گے کہ کبھی بات ایک مفروضے پر ختم ہوگئی، کبھی کسی بصیرت کے اظہار پر، کبھی کسی دکھائی دینے والے واقعے پر۔

روزمرہ کی غیر رسمی واردات سے ہٹ کر، کوئی بھی تجربہ، شخصی ہو یا اجتماعی، مجھ تک بالعموم ایک فکری اور تہذیبی سیاق کے ساتھ پہنچتا ہے۔ اسی وجہ سے' اظہار کی کسی بھی شکل کو میں اقدار کے سوال سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتا۔ ایک مسئلہ جو میری سوچ اور احساس پر برابر دستک دیتا رہتا ہے، ہمارے اجتماعی زوال کا ہے۔ ہمارا اپنا وجود' ہمارے قائم کیے ہوئے ادارے، ہماری معاشرتی زندگی اور ہمارے رویے زوال کی جس حد کو پہنچ چکے ہیں، اب اس سے آگے باقی کیا رہ جاتا ہے! مجھے یہ وسوسہ پریشان اور خوفزدہ رکھتا ہے۔ بے وقوف اور عقل مند' سب کے سب اپنے اپنے جہنم کی تعمیر میں لگے ہوئے ہیں۔

پچھلی تین کتابوں کی طرح ڈراموں کی یہ چوتھی کتاب بھی برادرم شاہد علی خاں صاحب کی توجہ سے شائع ہو رہی ہے۔ بہت شکر گزار ہوں۔

شمیم حنفی

ستمبر ۱۹۹۸ء

بازار

آوازیں:

۱۔ ساجد	جذباتی لہجہ
۲۔ آسیہ	طنزیہ لہجہ
۳۔ سلیم چچا	بھاری آواز، مجنونانہ انداز
۴۔ سلطان	
۵۔ سیما	

صوتی اثرات:

۱۔ بازار کا شور
۲۔ ٹرک کی آواز۔ بریک، ہارن
۳۔ مشینوں کی گھڑ گھڑاہٹ
۴۔ گھڑی کی ٹک ٹک
۵۔ موسیقی

پانچ متفرق آوازیں:
تین مردانہ آوازیں، دو نسوانی

ابتدائی موسیقی ۔ حُزنیہ ۔ فیڈ آؤٹ کے ساتھ ہی ملی جلی آوازوں
کا شور ابھرتا ہے ۔ بازار کا تاثر ___ ہارن مشینوں کی گھڑگھڑاہٹ
ٹرک کے انجن کی بھونڈی آواز، اچانک بریک لگتے ہیں ۔
(پس منظر سے ایک قہقہہ، مجنونانہ انداز)

وقفہ

ساجد : (ہانپتے ہوئے) آسیہ ! سُنا تم نے ؟ یہ آواز ___ کب سے میرا پیچھا کر رہی ہے یہ آواز ___ پتا نہیں کس سمت سے آتی ہے اور نیزے کی انی کی طرح سینے میں اُتر جاتی ہے ۔

[دور سے ، پھر وہی قہقہہ]

ساجد : آ آ آسیہ ! د د دیکھو ، دیکھو ___ پھر وہی آواز ۔ یہ آواز میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتی ۔ م م ۔ میں ، کیا کروں ؟ ___ بتاؤ ___ یہ کھڑکی ___ یہ روشن دان ___ دروازہ بند کر دو ___ (ہانپنے لگتا ہے)

آسیہ : ساجد کو جھنجھوڑتے ہوئے) ساجد ! پاگل ہو گئے ہو ؟ مت ماری گئی ہے تمھاری ؟ یہ سب کیا بکواس ہے ___ ؟ ڈرپوک کہیں کے ___ (ہنستی ہے)

(دور سے ، پھر وہی قہقہہ)

ساجد : پاگل میں نہیں ہوں ، تم ہو آسیہ ۔ تم اور وہ اور وہ اور وہ ۔ سب پاگل ہیں ۔ کتنا فرق ہے تمھاری ہنسی اور اس قہقہے میں ___ لگتا ہے ___ لگتا ہے ۔

آسیہ : کیا لگتا ہے ؟

ساجد : لگتا ہے قہقہہ نہیں، یہ رونے کی آواز ہے۔ قہقہہ نہیں، چیخ ہے۔
آسیہ : اونہہ۔ ابھی تک اس گھر میں بس سلیم چچا دیوانے تھے۔ اب تمھارا دماغ بھی چل گیا ہے۔

[سڑک سے گزرتے ہوئے ٹرک کا شور۔ اچانک بریک لگتے ہیں
مجنونانہ قہقہے کی آواز قریب آتی ہوئی]

ساجد : (کپکپاتی ہوئی آواز میں) اُف، کہاں جاؤں؟ کیا کروں؟ وہ آواز اب کوئی دم میں اندر آئے گی اور سینے میں اُتر جائے گی — آسیہ! آسیہ! دروازہ بند کردو!

[دروازہ بند ہونے کی آواز]

آسیہ : لو! اب تو چین آگیا تمھیں؟ ساجد؟ میں سمجھ نہیں پاتی کہ تم اتنی نادانی کی بات کاہے کو کرتے ہو۔ تم سب کچھ جانتے ہو۔ تمھیں پتا ہے کہ یہ آواز سلیم چچا کی ہے اور سلیم چچا دیوانے ہیں۔

[قدموں کی چاپ قریب آتی ہوئی۔ دروازے پر دستک]

ساجد : کک کون؟ کون؟
سلیم چچا : (باہر سے) آدمی کے دروازے پر آدمی ہی دستک دیتا ہے۔

[آسیہ دروازہ کھول دیتی ہے۔ سلیم چچا اندر آتے ہیں]

سلیم چچا : ارے — آسیہ، ساجد، تم دونوں کے چہروں پر ہوائیاں کیوں اُڑ رہی ہیں۔
آسیہ : بیٹھ جائیے چچا — بیٹھ جائیے۔ ان کا جی اچھا نہیں ہے۔

[سلیم چچا کرسی کھینچ کر بیٹھ جاتے ہیں۔]

سلیم چچا : تم دونوں نے وہ آواز سُنی تھی؟
آسیہ : کون سی آواز؟
سلیم چچا : ٹرک کے انجن کی — بے تحاشا دوڑتے بھاگتے آٹھ پہیوں والے اس بے ڈول جانور کی۔
ساجد : جانور؟ کون سا جانور!
سلیم چچا : جسے نیند نہیں آتی۔ جو آٹھوں پہر جاگتا رہتا ہے اور بھاگتا رہتا ہے۔ پتا نہیں۔ وہ کسی کا پیچھا کر رہا ہے، یا کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔

ساجد: ٹرک ــــ کون ــــ کس کا پیچھا کر رہا ہے ــــ؟ کب سے؟
سلیم چچا: اور تم نے بریک لگنے کی آواز سنی تھی۔ اچھا ہے۔ بریک لگنا چاہیے۔ اب ضرور لگنا چاہیے۔ یہ تماشا ختم ہونا چاہیے۔ اب سب کو رک جانا چاہیے۔ لیکن۔
ساجد: لل لیکن کیا؟
سلیم چچا: (طنز یہ ہنسی) ٹرک سوچ نہیں سکتے۔ اس لیے رُک نہیں سکتے۔ ٹرک آدمی نے اسی لیے بنایا تھا کہ وہ اس کے سکھ چین کی خاطر بھاگتا رہے۔ اب ٹرک بھاگ رہے ہیں اور اُن کے آگے بھی آدمی ہے اور پیچھے بھی آدمی ہے۔ اور آگے بھی آدمی کی ہوس کا تماشا ہے اور پیچھے بھی آدمی کی ہوس کا تماشا ہے۔ اور یہ تماشا ــــ ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔
آسیہ: (اکتاہٹ کے ساتھ) افوہ سلیم چچا! خدا کے لیے ایسی اداس کرنے والی باتیں نہ کیجیے ــــ ان کا جی پہلے ہی اچھا نہیں ہے۔
سلیم چچا: (اپنی رو میں) ٹرک بہت بدصورت ہوتے ہیں۔ ٹرک بہت بھوکے ہوتے ہیں۔ ٹرک بہت مضبوط ہوتے ہیں۔ ٹرک بہت لالچی ہوتے ہیں۔ ان کے شکم میں ہوس کا ایندھن جلتا ہے اور ان کے آگے بھی ہوس ہے اور پیچھے بھی ہوس ہے۔
آسیہ: (چیخ کر) سلیم چچا۔
سلیم چچا: (اُٹھتے ہوئے) اب میں چلتا ہوں۔ ساجد ــــ آسیہ ــــ کبھی سوچا ہے تم نے ــــ ہر ٹرک کے پیچھے چار حرف لکھے ہوتے ہیں۔ ایس، ٹی، او، پی ــ (STOP) مطلب یہ کہ رُک جاؤ ــــ رُک جاؤ ــــ مگر پیچھے مڑ کر کون دیکھ سکتا ہے بھلا؟

[اُٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ قدموں کی چاپ دور ہوتی ہوئی]

فیڈ آؤٹ

[موسیقی ــــ

فیڈ ان: گھڑی کی ٹک ٹک ٹک۔ شام کے پانچ بجتے ہیں۔

سلطان: (اپنے آپ سے) ارے! پانچ بج گئے! اسیما ابھی آئی نہیں۔

[کال بیل بجتی ہے ــــ سلطان کے قدموں کی چاپ ۔ دروازہ کھلتا ہے۔]

سلطان: بھئی واہ! ابھی ابھی میں نے سوچا تھا کہ تم کہاں رہ گئیں؟

سیما: اللہ ــــ آج تو جیسے قیامت کا سماں تھا سلطان!

سلطان: کیوں؟ کیا ہوا؟

سیما: بینک میں بھیڑ بہت تھی۔ خدا خدا کر کے وہاں سے نکلے۔ پالیکا بازار گئے۔ وہاں بھی بھیڑ بہت تھی۔

سلطان: کیوں؟

سیما: SALE لگی ہوئی ہے۔ کپڑوں کی ــــ تمہارے لیے دو قمیصیں خریدیں۔ اپنے لیے ایک ساری ــــ اور ایک ساری سعیدہ کی سالگرہ میں دینے کے لیے۔

سلطان: تو تم نے ساری خریداری آج ہی کر لی؟

سیما: ہاں! تو اس میں حیرانی کا ہے کی؟ ارے بھائی SALE لگی ہوئی تھی۔

سلطان: مم ــــ مگر

سیما: یہ اگر مگر کیا ہے؟

سلطان: مہینہ کیسے چلے گا۔

سیما: کیوں؟ جیسے ہمیشہ چلتا ہے!

سلطان: تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ یہ مارچ کا مہینہ ہے۔

سیما: تو کیا ہوا ــــ ہر سال مارچ آتا ہے!

سلطان: اور ہر سال ایسی ہی قیامت ڈھاتا ہے۔

سیما: کیسی قیامت؟

سلطان: اِس مہینے میں مجھے کل اڑسٹھ روپے ــــ ملے ہیں۔

سیما: (حیرانی سے) ہائیں؟

سلطان: (پُر خیال انداز میں) ہوں!

سیما: اب کیا ہوگا؟ مہینہ کیسے چلے گا؟

سلطان: تم بھول رہی ہو سیما ــــ دن اور مہینے نہیں چلتے۔ اصل میں ہم چلتے ہیں۔ وقت نہیں گزرتا۔ ہم گزرتے ہیں۔ سو گزر جائیں گے۔

سیما : فضول باتیں مت کرو۔ مجھے سوچنے دو!

سلطان : (اُسی رَو میں) تم نے صبح سویرے یا شام کو دیکھا ہوگا، اِدھر اُدھر کولونی کی سڑکوں پر، کتّے کی زنجیر ہاتھ میں تھامے، چہل قدمی کرتے ہوئے لوگوں کو — اوپر سے یہ لگتا ہے کہ کتّے کو ٹہلایا جا رہا ہے۔ جب کہ ہوتا یہ ہے کہ کتّے لوگوں کو ٹہلاتے ہیں۔

سیما : (زِچ ہوکر) سلطان خدا کے لیے —

سلطان : (اُسی لہجے میں) چاروں طرف SALE لگی ہوئی ہے۔ بیچنے اور خریدنے کا ایک اٹوٹ سلسلہ — ہونہہ — کبھی یہ سوچا ہے کہ اصل میں بکتا کیا ہے؟ (ٹھہر کر) چیزیں نہیں بکتیں! ہم بکتے ہیں۔ جبھی تو دِلوں کے ساتھ ہم ادھورے ہوتے جاتے ہیں۔

سیما : سلطان!

سلطان : چیزوں سے گھر بھرتے جاتے ہیں۔ ہم ہیں کہ اندر سے خالی ہوتے جاتے ہیں۔ اب یہی دیکھو کہ آج تم نے قمیضیں اور ساریاں خرید لیں — مگر اپنا سکون بیچ آئیں! ہر SALE میں یہی ہوتا ہے۔ سچ ہے — انسان خسارے میں ہے!

سیما : (چیخ کر) تم اپنی بکواس بند کرتے ہو یا میں یہاں سے اُٹھ جاؤں!

سلطان : (نرمی سے) پریشان مت ہو سیما — اور سوچ لو کہ ہم بازار میں ہیں اور دکان پر سامان بھرا پڑا ہے۔ اور بیچنے خریدنے کا سلسلہ جاری ہے اور بیچی جاتے والی چیزوں کے ساتھ خریدنے والا بھی بک رہا ہے۔

[دہشت خیز موسیقی کی ایک لہر۔ CHANGE OVER]

ایک آواز (مردانہ) : میں نریش ہوں۔ میں نے MBBS کیا ہے۔ میں اس شہر کے ایک بڑے اسپتال میں کام کرتا ہوں۔ میرے ساتھ میری ماں اور بابوجی رہتے ہیں میری تنخواہ چار ہزار روپے ہے۔ اس میں سے ڈھائی ہزار ہر مہینے فلیٹ کا کرایہ نکل جاتا ہے۔ بابوجی کی پنشن سے مہینے بھر کا اناج، سبزی اور دودھ نکل آتا ہے۔ باقی — بجلی کا بل، پانی کا بل، اسکوٹر کے لیے پٹرول کا خرچ — میرے ذمے۔ بس یوں چل رہی ہے گاڑی۔

[پس منظر سے ٹرک کے انجن کا شور، ابھرتا ہے پھر ڈوب جاتا ہے۔]

دوسری آواز: ایک کمرے کی یہ برساتی ____ جو ہمارا بیڈروم بھی ہے اور ڈرائنگ
(مردانہ) روم بھی ____ ہمیں ڈیڑھ ہزار کرایے پر ملی ہے۔ میں پدمنا بھن اور میری
بیوی ہیم وتی اور ہمارا بیٹا شالو یہاں رہتے ہیں۔ مجھے ہر مہینے تین ہزار ملتے ہیں۔
ہیم وتی کو دو ہزار۔

تیسری آواز (نسوانی): مگر ____ ہم چاہیں بھی تو روز ایک ناریل نہیں خرید سکتے۔

تیسری آواز: ہم چاہیں بھی تو سنیما ہال میں جاکر فلم نہیں دیکھ سکتے۔ مہینے میں ایک
بار بھی نہیں۔

دوسری آواز: ٹکٹ کے دام ____ پھر سنیما ہال تک آنے جانے کا خرچ۔ کچھ کھانا پینا ____
یہ سب ملاکر بہت ہو جاتا ہے ____ آؤٹنگ کا سارا مزا کرکرا ہو جاتا ہے۔

تیسری آواز: بس کسی نہ کسی طرح گاڑی چل رہی ہے۔

[پس منظر سے ٹرک کا شور۔ اچانک بریک لگتے ہیں۔ ہارن بجتے ہیں۔]

فیڈ آؤٹ

چوتھی آواز: میں شرما ہوں۔ اسکول آف آرکیٹیکچر سے میں نے TOP کیا تھا میری
(مردانہ) تنخواہ ساڑھے چھے ہزار ہے۔ کٹ کٹا کر چار ہزار ملتے ہیں۔ پراویڈنٹ
فنڈ (FUND) کی قسط۔ پھر P.F.LOAN کی قسط۔ ہزار روپے شانتا کو ملتے ہیں،
پرائیویٹ اسکول میں کام کرتی ہے۔

پانچویں آواز: ہمارا بینک اکاؤنٹ ZERO ہے۔ ہم ایک کلب کے ممبر ہیں مگر ہم
(نسوانی) چاہیں بھی تو وہاں نہیں جا سکتے۔

چوتھی آواز: ہم چاہیں بھی تو مہینے میں ایک روز کسی اچھے ہوٹل میں کھانا کھا نہیں سکتے۔

پانچویں آواز: ہم چاہیں بھی تو ٹیوشن یا کسی اور طرح کچھ اور کما نہیں سکتے۔

چوتھی آواز: دن بھر کی تھکن ____ شام کو ٹی۔وی کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں اور بس۔

پانچویں آواز: بس اسی طرح زندگی کی گاڑی چل رہی ہے۔

[پس منظر سے ٹرک کا شور۔ بریک لگنے کی آواز۔ ہارن]

فیڈ آؤٹ

فیڈ آؤٹ

فیڈ ان

(دور سے آتی ہوئی قہقہے کی گونج)

سلیم چچا: (دور سے۔ بھاری گرجدار آواز)

[وقفہ ــــ ہیجان خیز موسیقی کی ایک لہر]

سلطان: سیما! اتنی چپ اور اداس کیوں ہو؟

سیما: (رک کر) اگر قمیضیں اور ساریاں نہ خریدتی تو پیسے بچ گئے ہوتے۔

سلطان: (مضحک انداز میں) بازار اس لیے تو نہیں کہ وہاں سے خریداری نہ کی جائے۔ زمین کے اوپر، اور آسمان کے نیچے ــــ جو کچھ بھی ہے بکنے کے لیے ہے۔

سیما: فلسفہ نہ بگھارو۔ کام کی بات کرو!

سلطان: کام کی بات؟

سیما: ہاں ــ سوال مہینہ گزارنے کا ہے۔

سلطان: اس کی فکر مت کرو۔ مہینہ ہمیں گزار دے گا!

سیما: (زچ ہوکر) سلطان پلیز ــــ ہوش کی باتیں کرو!

سلطان: تم کرو۔ میں سنتا ہوں!

سیما: مارچ قرض لے کر گزار دیں۔

سلطان: یہ سوال بعد کا ہے کہ قرض ملے کا کہاں سے ــ خیر ــ مارچ قرض لے کر گزار دیں۔

سیما: اپریل کی تنخواہ اپریل نکال دے گا۔ اب رہا سوال مارچ کے قرض کو ادا کرنے کا۔

سلطان: اپریل کی تنخواہ اپریل نکال دے گا۔ اب رہا سوال مارچ کے قرض کو ادا کرنے کا۔

سیما: پہلی مئی سے ہم دونوں کی چھٹیاں ہیں۔

سلطان: ہیں!

سیما: ہم سرفراز کے یہاں چلے چلیں۔ تین چار ہفتوں کے لیے۔ بس کرایہ خرچ ہوگا آنے جانے کا۔ سو دو سو روپے اور سمجھ لو۔ باقی مہینے بھر کی مہمانی سے یہاں کا خرچ

بچ جائے گا۔ اس سے قرض ادا ہو جائے گا۔

سلطان : (ہنس کر) بھئی واہ۔ کیسی شاندار پلاننگ ہے۔ عورتیں سچ مچ مردوں سے زیادہ پریکٹیکل ہوتی ہیں۔

سیما : (تمسخر کے انداز میں) جی جناب۔

سلطان: چلو ـــــ یہ گمبھیر مسئلہ حل ہو گیا۔

سیما : (جھنجھلا کر) ابھی کہاں حل ہوا؟

سلطان : تو ہو جائے گا۔ یہ مان لینے میں کیا ہرج ہے کہ مسئلہ حل ہو گیا۔

سیما : لیکن ـــــ!

سلطان: لیکن کیا؟

سیما : مان لو کہ سرفراز بھی کہیں چلے گئے ہوں۔ آخر ان دونوں میاں بیوی کی چھٹیاں بھی تو پہلی مئی سے ہوں گی۔

سلطان : (پُرخیال انداز میں) ہاں! اور مارچ سرفراز کے لیے بھی مسئلہ بنا ہوگا۔ آخر وہ بھی تو نوکری ہی کرتے ہیں۔ اور پھر اُن کے شہر میں بھی SALE لگی ہوگی۔

سیما : (روہانسی ہو کر) میرا مذاق اُڑا کر اب تم زیادتی کر رہے ہو! لعنت ہے اس پر۔ اب ہمیشہ کے لیے توبہ!

سلطان : ایک ہمارے تمھارے توبہ کر لینے سے کیا ہوتا ہے۔ دنیا کا کاروبار تو اسی طرح چلتا رہے گا۔

فیڈ ان : پس منظر سے سڑک کا شور۔ ٹرک۔ مشینیں۔ ہارن۔ ملی جلی آوازیں
[موسیقی کی ایک لرزہ خیز لہر]

ساجد: (کانپتی ہوئی آواز) اُف! میرے تو کان پک گئے اس آواز سے۔ بند کر دو دروازہ۔ آسیہ! کھڑکی بھی بند کر دو!

آسیہ : تم سچ مچ ہوش کھو بیٹھے ہو ساجد۔ ہم اپنے دروازے اور کھڑکیاں بند کر لیں، اپنی آنکھیں بند کر لیں، اس سے دنیا کا کاروبار تو بند نہیں ہو جائے گا۔

ساجد: (کانپتی ہوئی آواز) مجھے اس لفظ سے ڈر لگتا ہے۔ کاروبار — کیسا بدصورت اور بے ہودہ لفظ ہے۔

آسیہ : تم پھر بہک گئے ساجد !

ساجد : اس لفظ نے کسی کو کہیں کا نہیں رکھا۔ صبح سے شام تک، شام سے صبح تک اسی لفظ کا ہنگامہ جاری ہے۔ خاموش راتوں کے سکون کو چیرتی ہوئی بدہیئت آوازیں۔ مشینیں۔ کارخانے اور ٹرک ــــ اُف ــــ لوگ سمجھتے کیوں نہیں۔

آسیہ : جنھوں نے سمجھ لیا اُنھیں بھلا کون سا سکھ مل گیا۔

ساجد : (پُرخیال انداز میں) ہوں ــــ تم سلیم چچا کی بات کر رہی ہو ؟

آسیہ : تمھیں یاد ہے ــــ سلیم چچا کے کیا عیش تھے۔ نوکر چاکر، کارخانے، زمینیں، فراغتیں۔

ساجد : (اسی انداز میں) ہوں !

آسیہ : پھر بیٹوں کی آپسی چپقلش نے سب کچھ برباد کر کے رکھ دیا ناں !

ساجد : وہ سب مریض تھے۔ لالچی اُنھیں زندگی کے وسیلے انسانی رشتوں سے زیادہ عزیز تھے۔

آسیہ : سلیم چچا دیوانے ہیں۔ تم بھی دیوانے ہو۔ سلیم چچا کے بیٹوں نے جو کیا اُنھیں وہی کرنا چاہیے تھا۔

ساجد : (کپکپاتی ہوئی آواز) اور اس سب کا نتیجہ بھی دیکھ رہی ہو تم ؟ تم دیکھ رہی ہو سلیم چچا کی حالت !

آسیہ : اپنی یہ دُرگت انھوں نے خود بنائی ہے۔ آخر اپنے بیٹوں کے ساتھ جا کر کیوں نہیں رہتے۔

ساجد : تمھیں بوجھ لگتا ہے اُنھیں اپنے ساتھ رکھنا ؟

آسیہ : اُلٹی باتیں مت سوچو ساجد ! میں اتنی کم ظرف نہیں ہوں۔ اور میں جانتی ہوں کہ وہ تمھارے سگے چچا ہیں۔

ساجد : پھر ؟

آسیہ : پھر کیا ؟ مجھے تو ان کی حالت پر ترس آتا ہے۔ اُن کے بیٹوں کے پاس کیا نہیں ہے۔ آپس میں لڑ بھڑ کر بھی مزے میں ہیں۔ سب کے پاس اپنی کوٹھی ہے، کار ہے، نوکر چاکر ہیں۔ گھر میں دنیا جہان کی چیزیں بھری پڑی ہیں۔ کہاں کہاں سے کیسی کیسی شاندار

چیزیں منگوائی ہیں۔
ساجد : آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟
آسیہ : وہ ہم سے تو بہتر ہی ہیں۔ سلیم چچا ان کے ساتھ رہتے تو ہم سے بہتر رہتے۔
ساجد : ہمارے پاس کیا نہیں ہے؟
آسیہ : ہمارے پاس کیا ہے؟
ساجد : (فلسفیانہ انداز میں) وہ چیزیں جو دکھائی دیتی ہیں، ان کا موازنہ ایسی چیزوں سے کرنا جو دکھائی نہ دیں، محض بے وقوفی ہے۔
آسیہ : کیا دکھائی دیتا ہے؟ اور کیا نہیں دکھائی دیتا؟
ساجد : (غصّے میں) امپورٹڈ گاڑیاں اور مشینیں اور عالیشان مکان اور کارخانے دکھائی دیتے ہیں ـــــ مگر اپنے اندر کی پیاس اور محرومی اور بے حصولی کا احساس، رشتوں کی بربادی کا احساس ـــــ یہ سب کسی کو نہیں نظر آتا۔ لوگ بھول گئے کہ خیال اور احساس بھی اپنا وجود رکھتے ہیں۔
آسیہ : اُسی طرح جیسے ریفریجریٹر، اور میوزک سسٹم، اور ایئر کنڈیشنر ـــــ (ہنستی ہے)
ساجد : تو تمھیں ان چیزوں کی طلب تھی؟
آسیہ : اگر کہہ دوں کہ آج بھی ہے تو؟
ساجد : (افسردگی سے) پھر تم نے غلطی کی ـــــ تمھارے لیے میری جگہ۔
آسیہ : (چیخ کر) ساجد!
[سلیم چچا کا قہقہہ، دور سے آتی ہوئی آواز۔ قدموں کی چاپ قریب آتی ہے۔ دروازے پر دستک ـــــ]
آسیہ : (دروازہ کھولتے ہوئے) آپ؟ سلیم چچا!
سلیم چچا : تم دونوں پھر لڑ رہے تھے۔ (ہنستے ہیں) ٹھیک ہے۔ خالی نہیں بیٹھنا چاہیے۔ کرنے کو کچھ بھی نہ ہو تو لڑنا چاہیے۔ اس سے دماغ چوکس رہتا ہے۔
ساجد : بیٹھیے چچا!
[سلیم چچا کرسی کھینچ کر بیٹھ جاتے ہیں]

آسیہ: غلطی میری نہیں تھی!
سلیم چچا: تو میں کب تمھیں الزام دے رہا ہوں بیٹی۔
آسیہ: آپ نے سوچا ہوگا کہ میں کتنی بدتمیز ہوں ــــ آپ جانتے ہیں، مجھے اتنی اونچی آواز میں بولنے کی عادت نہیں ہے ــــ مگر ــــ
سلیم چچا: اوہو ــــ تو پریشان کیوں ہو؟ چاروں طرف شور بہت ہے۔ شور میں سرگوشی سنائی نہیں دیتی عزیزو ــــ تم نے چیخ کر غلطی نہیں کی۔ تم نے دیکھا ہے ناں! لوگوں کے کان گنگ ہو گئے ہیں۔

[دور سے آتی ہوئی شور کی آواز۔ ٹرک کے انجن کی گھڑگھڑاہٹ۔ اچانک بریک لگتے ہیں۔ ایک لمبی چیخ ــــ ملی جلی آوازیں۔ ساجد تیزی سے دروازہ کھولتا ہے اور باہر نکل جاتا ہے۔]

آسیہ: (گھبراکر) کیا ہوا ــــ اللہ ــــ میرا تو دل بیٹھا جاتا ہے۔ باہر یہ بھیڑ کیسی ہے۔
سلیم چچا: (اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے) باہر بھی بھیڑ ہے۔ اندر بھی بھیڑ بہت ہے۔ کوئی اکیلا نہیں۔ اسی لیے تو لوگ سوچنا بھولتے جاتے ہیں۔
آسیہ: (بیزاری سے) باہر کوئی حادثہ ہوگیا چچا۔
سلیم چچا: حادثوں کا ایک سلسلہ ہے زندگی۔ چلو ــــ (بے نیازانہ لہجے میں) اس سلسلے میں ایک اور کڑی جڑ گئی۔ اے عزیز ــــ پریشان ہونے سے حاصل؟

[بھاگتے ہوئے قدموں کی چاپ قریب آتی ہوئی۔]

(ساجد اندر آتا ہے۔)

آسیہ: کیا ہوا ساجد!
ساجد: دونوں بُری طرح زخمی ہیں۔ ڈرائیور بھاگ گیا!
آسیہ: دونوں کون؟
ساجد: میاں بیوی معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کے اسکوٹر اور ٹرک میں ٹکّر ہوگئی۔
آسیہ: دونوں زخمی ہیں؟
ساجد: ہاں! لوگ انھیں اسپتال لے گئے۔
آسیہ: کون ہیں؟ کچھ پتا چلا؟ کم سے کم اُن کے گھر والوں کو تو خبر ہو جانی چاہیے!

ساجد: مرد کی جیب میں آئڈنٹی ٹی کارڈ IDENTITY CARD تھا۔ سلطان حیدر ــــ دونوں شاید بازار سے آرہے تھے۔ پولی تھین بیگز (BAGS) میں خریدی ہوئی ساڑیاں اور کُرتے۔

آسیہ: اوہ ہاں! آج کل SALE لگی ہوئی ہے۔

ساجد: کب نہیں لگی رہتی یہ سیل؟ لوگ خریدتے رہیں گے۔ چاہے قرض لینا پڑے اس کے لیے۔

آسیہ: (بیزاری سے) اونہہ! بے چارے! بچ تو جائیں گے ناں!

ساجد: (کھوئی ہوئی آواز میں) ہاں، اس حادثے سے تو شاید بچ جائیں گے۔ مگر ــــ یہ تو ایک سلسلہ ہے۔

[سلیم چچا کی ہنسی]

آسیہ: چچا! یہ کون سی ہنسی کی بات تھی؟

ساجد: (تنبیہہ کے انداز میں) آسیہ!

آسیہ: (سنبھل کر) میں تو یونہی پوچھ رہی تھی۔ مگر یہ ہوا کیسے؟

ساجد: ٹرک کی رفتار تیز تھی۔ اسکوٹر کی رفتار بھی تیز تھی۔ دونوں نے بریک لگائے۔ پھر بھی ٹکّر ہوگئی۔

[پس منظر سے حزینہ موسیقی کی ایک لہر
سلیم چچا کا مجنونانہ قہقہہ]

ساجد: (گھبرا کر) سلیم چچا! سلیم چچا!

سلیم چچا: عزیزو۔ گھبراؤ نہیں! اتنی زور سے مت بولو۔ میں سُن رہا ہوں تم دونوں کی باتیں ــــ دیر سے سُن رہا ہوں اور صرف ایک بات سوچ رہا ہوں!

آسیہ: کیسی بات؟ کیا سوچ رہے ہیں!

سلیم چچا: دیکھو ــــ سڑک کے اس موڑ سے پہلے ایک اسپیڈ بریکر بن جانا چاہیے۔

ساجد: (دھیرے سے) SPEED BREAKER۔

سلیم چچا: ہاں ــــ رفتار پر کسی کا قابو نہیں رہا، اور سب بے لگام ہیں، اور انسانوں اور گاڑیوں کو ــــ سب کو کہیں پہنچنے کی جلدی ہے۔ اور کسی کو احساس نہیں کہ یہ

راستے بس راستوں تک لے جاتے ہیں۔ اور کوئی دم لینے کے لیے بھی ٹھہرنا نہیں چاہتا۔ اور سب کے سب ایک پاگل دوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔

[پس منظر سے ہیجان خیز موسیقی]

سلیم چچا: (کانپتی ہوئی آوازیں) اور عزیزو ـــــ جب رفتار پر بس نہ چلے تو ضروری ہے کہ راستوں پر رکاوٹیں کھڑی کردی جائیں۔ اسپیڈ بریکرز۔

[پس منظر سے ہیجان خیز موسیقی]

ساجد: سلیم چچا! (خوفزدہ لہجے میں) سلیم چچا!

سلیم چچا: اور جان لو کہ اسپیڈ بریکرز نہیں بنے تو کل، پھر اس کے اگلے روز، پھر اس کے اگلے روز اور پھر اُس کے اگلے روز۔

[آسیہ کی کھنکتی ہوئی ہنسی۔ مسلسل۔ دیوانہ وار۔]

سلیم چچا: اور پھر اُس کے اگلے روز۔

ساجد: سلیم چچا ـــــ!

[آسیہ کی ہنسی]

سلیم چچا: اور پھر اُس کے اگلے روز۔

[آسیہ کی ہنسی کی آواز اونچی ہوتی جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ہیجان خیز موسیقی کی گت تیز ہوتی جاتی ہے۔]

فیڈ آؤٹ

△△

چوراہا

آوازیں :

۱۔ چچامیاں	عارف اور آصف کے والد۔ بوڑھے، چالاک، دنیادار بزرگ
۲۔ چچی امّی	عارف اور آصف کی والدہ
۳۔ عارف	جذباتی خواب پرست نوجوان
۴۔ آصف	نوجوان، کالج کا طالب علم
۵۔ مجّن میاں	چچامیاں کے دوست۔ چرب زبان۔ گھاگ
۶۔ ظہیر خالو	عارف اور آصف کے خالو
۷۔ رحیمن	ملازمہ
۸۔ مقرر	
۹۔ قلی	

کمار گندھرو کی آواز میں کبیر داس کا بھجن : "کون ٹھگوا نگریا لوٹل ہو"

ابتدائی موسیقی ـــــ (دھیمی اور حزنیہ)
فیڈ آؤٹ کے ساتھ ہی دور سے چچا میاں کی آواز آتی ہے۔

چچا میاں: آصف! او آصف!

آصف : (دور سے) آرہا ہوں۔ (بھاگتا ہے)

چچا میاں: (جھنجھلا کر) آرہا ہوں! لاٹ صاحب کہیں کے۔ کتنی بار کہا کہ بڑوں کو جواب اس طرح نہیں دیا جاتا۔

آصف : (دھیرے سے) جی!

چچا میاں: اب جی جی کیا کہہ رہے ہو! جب کوئی پکارے تو کہنا چاہیے "حاضر ہوں" یہ کیا لٹھ مار جواب ہے۔ "آرہا ہوں"! ارے میاں تمیز تہذیب سب دنیا سے رخصت ہوگئی۔ اب تم لوگوں کو بھلے آدمیوں کی طرح بولنا آتا ہے، نہ اُٹھنا بیٹھنا!

آصف : جی!

چچا میاں: اور تمھاری چچی کیا کر رہی ہیں؟

آصف : ببرچی خانے میں ہیں۔

چچا میاں: جاؤ! کہو ہم انھیں یاد فرما رہے ہیں۔ ذرا پل بھر کو سن لیں۔

آصف : جی اچھا (جاتا ہے) (دور سے) چچی امی! آپ کو چچا میاں بلا رہے ہیں۔

(دونوں آتے ہیں)

چچا میاں: (بگڑ کر) لاحول ولا قوۃ۔ پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ "چچا میاں بلا رہے ہیں!" تم یہ نہیں

کہہ سکتے تھے کہ یاد فرما رہے ہیں؟ ہاتھ پاؤں گز بھر کے ہوگئے مگر بات کرنے کا سلیقہ نہ آیا۔

چچی امّی : ہے ہے۔ میں کہتی ہوں ایسی کیا قیامت آگئی۔

چچا میاں : قیامت نہیں تو اور کیا ہے۔ سب تباہی کے آثار ہیں۔ چچا میاں بلا رہے ہیں۔ ہونہہ۔

چچی امّی : تم بھی خانخواہ بات کا بتنگڑ بنائے دیتے ہو! میں کہتی ہوں ایسی کون سی چھت لوٹ پڑی۔ بچہ ہے دھیرے دھیرے سیکھ جائے گا۔

چچا میاں : (طنزاً) جی جی ہاں۔ یہ لمڈھک ہوگیا۔ ابھی بچہ ہی بنا ہوا ہے۔ اور عارف کہاں ہے۔

چچی امّی : ہوگا کہاں، وہیں چھت پر۔ شام کا وقت ہے۔ کتنا کہا بیٹا دونوں وقت مل رہے ہوں تو یوں مُنہ چھپائے کمرے میں نہ پڑے رہا کرو۔ مگر اس پر اثر ہی نہیں ہوتا۔

آصف : کمرے میں نہیں ہیں بھائی جان۔

چچا میاں : پھر کہاں ہے؟

آصف : چھت پر۔

چچی امّی : اے لو! چھت پر کیا کر رہے ہیں، میں تو سمجھتی تھی کمرے میں گھسے پڑھ رہے ہوں گے۔

آصف : بھائی جان تو روز شام کو دیر تک چھت پر بیٹھے رہتے ہیں۔

چچا میاں : کیا کرتا رہتا ہے وہاں!

آصف : آسمان کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ (ہنستا ہے)

چچا میاں : دماغ سنک گیا ہے اس کا۔ ہونہہ جاؤ کہو میں بلا رہا ہوں۔

(آصف جاتا ہے)

چچی امّی : اب تم ہاتھ دھو کے اس کے پیچھے نہ پڑ جانا۔

چچا میاں : افوہ! تم تو سمجھتی ہو میری عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے۔ میں بھلا اس کے پیچھے کاہے کو پڑوں گا۔ لیکن میں کہتا ہوں۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی، آسمان کی طرف تکتا رہتا ہے۔ میں سب جانتا ہوں۔ کسی سے نظر بازیاں ہو رہی ہوں گی۔

چچی امّی : اے لو! اب یہ ایک نئی بات نکالی تم نے۔

چچا میاں : تو کیا میں غلط کہتا ہوں؟

چچی امّی : اور نہیں تو کیا؟ اپنا عارف ایسا نہیں ہے۔

چچامیاں : ایسا تو عارف کا باپ بھی تھا۔ یاد کرو! تم بھی تو روز شام کو چھت پر آجاتی تھیں اور میں اپنی چھت سے ــــ (ہنستے ہیں)

چچی امی : ختم کرو یہ چوچلے۔ بوڑھے ہونے کو آئے ــــ توبہ۔

(عارف اور آصف کے قدموں کی چاپ)

چچامیاں : ششش شی۔

(دونوں اندر آتے ہیں)

چچامیاں : تو میاں! یہ تم چھت پر کیا کرتے رہتے ہو؟

عارف : کچھ بھی تو نہیں۔ یونہی بیٹھا تھا۔

چچامیاں : میں بھی تو سنوں ــــ یونہی بیٹھے کیا کر رہے تھے؟

عارف : (کھوئی ہوئی آواز میں) پرندے ــ پرندے لوٹ رہے تھے۔

چچامیاں : یہ دیکھو! میں نہ کہتا تھا۔ پرندے ــ پرندے۔ آخر مطلب کیا ہے تمھارا؟

عارف : کچھ بھی نہیں چچامیاں۔

چچامیاں : لل لیکن ــــ پرندے۔

چچی امی : اُفوہ! چھوڑو بھی۔ تم تو بات کا بتنگڑ بنانے کے عادی ہو گئے ہو۔

چچامیاں : (ایک طویل سانس لے کر) اچھا خیر ــــ تو تم یہ کرو کہ آصف کو لے کر حکیم ابن صاحب کے پاس چلے جاؤ، میرا اسلام عرض کرنا۔ پھر کہنا کہ جو نسخہ اب تک چل رہا تھا اس سے تو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔

عارف : مگر اسے دواؤں کی ضرورت ہی کیا ہے؟

چچامیاں : (بگڑ کر) تو تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو؟

چچی امی : ٹھیک تو کہہ رہا ہوں۔ ایسی کون سی بیماری اس کی جان کو لگی ہوئی ہے جو تم نسخے پر نسخہ گھول گھول کر پلائے جا رہے ہو۔ اسے یہی نا کہ ذرا غائب دماغ رہتا ہے۔ بچپن ہے۔ عمر کے ساتھ یہ بات جاتی رہے گی۔

چچامیاں : خدا کے لیے تم ان باتوں میں ٹانگ نہ اُڑایا کرو۔ عارف! تم لے جاؤ اسے۔

عارف : جی اچھا۔

(دور دروازے پر دستک)

چچی امّی: اے ذرا دیکھو تو بیٹا کون ہے یوں کواڑ پیٹے جا رہا ہے۔ ہو نہ ہو وہی مجّن میاں ہوں گے؛ اُٹھائی گیرے۔

(عارف جاتا ہے)

چچا میاں: (دھیرے سے) اری نیک بخت۔ تمھاری زبان کو کیا ہو گیا ہے۔ میں کہتا ہوں غریب گھڑی دو گھڑی کے لیے آجاتے ہیں، میرا دل بھی بہل جاتا ہے۔

چچی امّی: ہونہہ۔ گھڑی دو گھڑی کے لیے! آتے ہیں تو بس چپک جاتے ہیں۔ اُٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے۔

چچا میاں: (ٹالتے ہوئے) اچھا تو تم یہ کرو کہ ذرا پان بنا دو۔ اور آصف تم ذرا حقّہ تازہ کر دو۔ اور عارف سے کہو کہ ذرا شطرنجی بھی بچھا دیں۔

چچی امّی: ابھی تو حکیم صاحب کے ہاں جانے کی رٹ لگی ہوئی تھی۔ اب سب کچھ چھوڑ کر موئی جوئے بازی کا چکر شروع ہو گیا۔ مجّن میاں کا کیا ہے؟ جورو نہ جاتا، آوارگی سے ناطہ۔

چچا میاں: اے بی بی۔ کچھ تو سمجھو تمھاری یہ بکواس اس غریب نے سن لی تو۔

چچی امّی: میں بکواس کر رہی ہوں۔

چچا میاں: (زِچ ہو کر) نہ نہیں نہیں۔ بیگم۔ بیگم۔ تم جو فرما رہی ہو۔ سوچو تو گھر آئے مہمان کی توہین۔

چچی میاں: تو اب وہ مہمان بھی ہو گئے ہیں لاکھ برس یہ نہ ہونے دوں گی۔ مجھ سے یہ رت جگا نہ ہو گا آدھی آدھی رات تک موئی بازیاں لگ رہی ہیں۔ چالیں چلی جا رہی ہیں۔ حقّے کی گڑگڑی لگی ہوئی ہے۔ پان پر پان بنائے جا رہے ہیں۔ یہ سب کرنا ہے تو کہہ دو کہ اپنے گھر۔

چچا میاں: (بگڑ کر) تو دروازے بند کر دوں ٹکا سا جواب دے دوں۔ ساری بستی میں اپنی ہنسی اڑواؤں کہ بڑے رئیس زادے بنتے ہیں اور گھر آتے مہمان کو۔۔۔۔

چچی امّی: میں کہتی ہوں وہ مہمان کب سے ہو گئے ہمارے؟ ان کا گھر نہیں ہے؟

چچا میاں: اچھا تو ٹھیک ہے۔ میں ہی چلا جاتا ہوں ان کے گھر — آجاؤں گا گھنٹے بھر میں۔

چچی امّی: میں کہے دیتی ہوں۔ نہ تمھیں جانے دوں گی نہ انھیں یہاں ٹکنے دوں گی۔ یہ گھر ہے! کوئی سرائے نہیں ہے۔ مسافر خانہ نہیں ہے چوپال نہیں ہے۔ سمجھے۔

(ملے جلے قدموں کی آواز قریب آتی ہے)

عارف: یہ ظہیر خالو آئے ہیں۔

چچی امّی : (حیرت سے) ایں اررر ر ظہیر میاں۔
چچامیاں : کک کون محبّن میاں۔ محبّن میاں نہیں آئے۔ ظظ۔ ظہیر میاں۔
ظہیرخالو : (تنک کر) آتے ہی بے آبروئی ہوئی۔ میں واپس جاتا ہوں۔ رات مسجد میں کاٹ لوں گا۔
چچی امّی : اے ہے۔ تم سمجھو تو۔ ہم اصل میں ـــــــــــ
ظہیرخالو : جانے دیجیے آپا۔ میں نے سب سُن لیا ہے۔ یہ مسافر خانہ نہیں ہے۔ سرائے نہیں۔ چوپال نہیں۔ اب میں ایسا بے غیرت تو نہیں کہ۔۔۔
چچامیاں : ارے بھائی۔ یہ سب تمھارے لیے تھوڑی کہا جا رہا تھا۔
ظہیرخالو : اب باتیں نہ بنایئے بھائی صاحب۔
چچامیاں : یقین جانو۔ واللہ۔ وہ تو ایک اور صاحب ہیں، اٹھائی گیرے۔ جب دیکھو وارد ہو جاتے ہیں۔ نہ دن دیکھیں نہ رات اور میں ٹھہرا مروّت والا آدمی۔ کوئی اور تو مُنہ لگاتا نہیں۔
ظہیرخالو : کون صاحب ہیں؟
چچامیاں : ارے ہیں ایک صاحب۔ بگڑے نواب۔ محبّن میاں۔
ظہیرخالو : وہی تو نہیں جو حسن پور کے تعلّقہ دار تھے۔
چچی امّی : ہاں ہاں وہی! تو تم انھیں جانتے ہو۔
چچامیاں : ارے شیطان کی طرح مشہور ہے وہ شخص۔ سنا ہوگا نام کسی سے۔ اس کی حرکتیں ہی ایسی ہیں۔ تمھاری آپا کو تو خدا جھوٹ نہ بلوائے اس کے نام سے نفرت ہے۔ یہ اسی کو سمجھ کر اوّل فول بک رہی تھیں۔
چچی امّی : کیا کہا؟ اول فول بکیں میرے دشمن۔
چچامیاں : ارے بھائی تم نے جو کہا سو فی صدی سچ کہا۔ میں خود اس شخص کی صورت دیکھنے کا روادار نہیں ہوں۔ میرا تو بس یہ ہے کہ گھر کوئی بھی آجائے، کیسے دھتکار دوں اسے!

(دروازے پر دستک)

چچی امّی : اے ہے۔ بیٹا عارف، ذرا دیکھو تو پھر کوئی ٹپک پڑا۔ خدا جانے کون ہے؟

(عارف جانے لگتا ہے)

چچامیاں : اور پھر آصف کو حکیم ابّن کے پاس لے جاؤ۔ سمجھے اور کہنا کہ اس نسخے سے کوئی خاص۔
چچی امّی : اوں ہوں: پہلے اسے دیکھنے تو دو کون آیا ہے۔ جاؤ عارف۔

(عارف جاتا ہے)

وقفہ

(عارف واپس آتا ہے)

چچا میاں: کون ہے۔

عارف: نواب محبّن آئے ہیں۔

چچا میاں: ہم محبّن میاں۔ محبّن میاں۔ بٹھا دیا انھیں۔

چچی امی: آگئے پھر اپنی اوقات پر۔

ظہیر میاں: کیا بات ہے آپا جان۔ میں تو کچھ سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔

چچا میاں: عارف۔ بیٹے۔ جاؤ بٹھاؤ انھیں دیوان خانے میں۔ اور حقہ۔ اور بیگم تم ذرا پان ــــــ

چچی امی: سُن رہے ہو ظہیر! ابھی ان کے نام پر صلواتیں بھیجی جا رہی تھیں۔ اب آنکھیں بچھائی جا رہی ہیں۔

چچا میاں: اور ظہیر میاں ہاتھ مُنہ دھو لو۔ کھانا میں ذرا دیر سے کھاتا ہوں۔ سمجھیں بیگم۔ عارف اور آصف کے ساتھ کھانا کھلا دو انھیں، بھائی معاف کرنا۔ میں ذرا دیکھ لوں۔ خدا جانے کس ضروری کام سے اس وقت آگئے ہیں محبّن میاں۔

چچی امی: ضروری کام؟ مجھے سب پتا ہے۔ وہ ضروری کام تم بھی دیکھ لینا اپنی آنکھوں سے ظہیر میاں!

چچا میاں: اچھا تو میں ذرا دیوان خانے میں چلتا ہوں۔

(جاتے ہیں)

موسیقی

(موٹر کے ہارن۔ سڑک پر ٹریفک کا شور)

عارف: آصف!

آصف: جی بھائی جان

عارف: یہ کھڑکی بند کر دو۔ شور بہت ہے۔

(کھڑکی بند کرتا ہے)

عارف: کیا ہوا؟ آج کوئی خط آیا گھر سے۔

آصف : جی یہ ڈاک آئی ہے۔

عارف : (خط پڑھتے ہوئے) ہم لوگ اگلی جمعرات کو نکلیں گے۔ جمعہ کی صبح کو تمھارے پاس آجاویں گے۔ اسٹیشن یا تو خود آجانا یا پھر آصف کو بھیج دینا نہیں تو مشکل پیش آئے گی۔ باقی سب خیریت ہے۔ ہاں یہ خیال رہے کہ ہمارے ساتھ اسباب بہت ہوگا اس لیے کسی یکّے والے سے بات کرلینا۔ (ہنستا ہے)

آصف : کیا ہوا بھائی جان!

عارف : چچا میاں نے لکھا ہے کہ کسی یکّے والے سے بات کرلینا۔ شاید وہ اسی گمان میں ہیں کہ یہاں یکّے چلتے ہیں۔ جمعہ کی صبح کو آرہے ہیں۔ اسٹیشن تم چلے جانا۔ مجھے تو دفتر پہنچنے کی جلدی ہوگی۔ ویسے میں اس روز جلدی ہی لوٹ آؤں گا۔

آصف : اور ہاں، چچا میاں کبوتروں کی جوڑی بھی تو لا رہے ہیں اپنے ساتھ۔ ان کا انتظام بھی کرنا ہے۔

عارف : (دروازہ کھولتے ہوئے) ارے آپ مجّن چچا!

مجّن میاں: ہاں میاں! کب سے تمھارا گھر ڈھونڈ رہا ہوں۔ پتا تو خیر میں نے تمھارا خط ملنے سے پہلے ہی لے لیا تھا۔

عارف : تو آپ آئے کب؟

مجّن میاں: کوئی ہفتہ بھر ہوا۔

عارف : ٹھہرے کہاں ہیں؟ خیر اندر تو آیئے۔ (دونوں اندر آتے ہیں) تو آپ ٹھہرے کہاں ہیں؟

مجّن میاں: ایک ننھیالی عزیز رہتے ہیں وہ کیا نام ہے کرشنا کالونی میں۔ انہی کے ساتھ قیام ہے۔ اب سوچ رہا ہوں اپنا کاروبار؟

عارف : کاروبار؟ کیسا کاروبار؟

مجّن میاں: وہ جو ہم سے چل سکے۔ یہ ٹیکسیوں کا کاروبار کیسا رہے گا۔

عارف : ٹیکسیاں؟

مجّن میاں: ہاں! اگر دو گاڑیاں خرید لوں تو گزارا ہو جائے گا۔ میرے وہ عزیز بھی یہی کرتے ہیں۔ ان سے مشورہ کیا تو یہی سمجھ میں آیا۔ باہر ٹیکسیاں چلیں گی۔ ہم آرام سے گھر میں بیٹھے رہیں گے۔

عارف : (کچھ سوچتے ہوئے) گھر سے چچا میاں کا خط آیا ہے۔ وہ اور چچی امی جمعہ کی صبح کو آرہے ہیں۔ (ہنس کر) چچا میاں نے لکھا ہے کہ کسی یکّہ بان سے بات کرلوں، انھیں اسٹیشن سے گھر لانے کے لیے۔

مجن میاں: جواب نہیں بھائی صاحب کا بھی۔ میں نے جب گھر چھوڑا تو کہتے تھے کہ شہر ہی اصل میں رہنے کی جگہ ہے۔ گاؤں میں اب رکھا کیا ہے؛ اور یہ بھی کہتے تھے کہ شہر میں سواری کے نام پر بسیں اور ٹیکسیاں چلتی ہیں۔ پھر یکے کا خیال انھیں کیسے آیا۔

عارف : وہ تو ٹھیک آیا مجن چچا۔ سب کچھ بھول جانا بھی اچھا نہیں۔

مجن میاں: ارے میاں دیکھنا! شہر آکر سب کچھ بھول جائیں گے۔

عارف : پرندے دن بھر مارے مارے پھرتے ہیں۔ شام تک اپنے بسیروں کو لوٹ آتے ہیں۔ راستہ بھول تو نہیں جاتے۔

مجن میاں: (حیرت سے) پرندے؛ یہ پرندے اچانک کیسے یاد آگئے۔

عارف : (ہنس کر) چچا میاں کبوتروں کی ایک جوڑی بھی ساتھ لارہے ہیں۔

مجن میاں: (حیرت سے) کبوتر، یعنی کہ کبوتر؛

عارف : ہاں! کبوتر۔ وہ سفید کبوتروں کی جوڑی۔

مجن میاں: تو گویا کہ کبوتر بھی سفر کریں گے ان کے ساتھ! ریل گاڑی میں؛

عارف : ہاں۔ زمین کا سفر۔ اس میں حرج کیا ہے؛

مجن میاں: حرج کی تو کوئی بات نہیں مگر یہاں ان کا بندوبست۔

عارف : سب ہوجائے گا۔ جب چچا میاں یہاں رہ سکتے ہیں تو کبوتر بھی رہ سکتے ہیں۔

مجن میاں: (اکتا کر) اچھا تو میاں میرا ایک کام بھی کردو۔ ٹیکسیوں کا لائسنس۔

عارف : اور ڈرائیور۔

مجن میاں: وہ تو بعد کی بات ہے۔ پہلے تو لائسنس ملنا چاہیے۔ موٹریں تو میں آج خرید لوں! سیکنڈ ہینڈ آسانی سے مل جاتی ہیں۔ جب سے پٹرول مہنگا ہوا ہے لوگ دھڑا دھڑ اپنی گاڑیاں بیچ رہے ہیں۔ میرے وہ عزیز جن کے ساتھ میں ٹھہرا ہوا ہوں شاید دو چار آدمیوں سے بات بھی کر چکے ہیں۔ کہتے تھے کہ ہاتھ کے ہاتھ موٹریں مل جائیں گی۔

عارف : لائسنس میں بنوا دوں گا۔ اس دفتر میں میری جان پہچان ہے۔

مجن میاں: اسی لیے تو تم سے کہہ رہا ہوں۔ تمھارا دفتر بھی تو اسی بلڈنگ میں ہے۔
عارف : تو آپ کو سب کچھ معلوم ہے۔ (ہنس کر) آپ شہر میں اجنبی نہیں معلوم ہوتے۔
مجن میاں: اجنبی تو ہم دیہات میں بھی نہیں تھے۔ جیسا دیس ویسا بھیس۔ شہر کو سمجھنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ میں نے تو اپنے تعلقے کی بربادی سے اس آبادی کا بھید سمجھا ہے۔ اس آبادی میں قدم رکھنے سے پہلے ہی سمجھ لیا تھا بھائی۔ (ایک لمبی سانس بھرتے ہیں۔)
عارف : (کچھ سوچتے ہوئے۔ دیکھیے چچا میاں کا کیا حال ہوتا ہے۔ میں تو اب تک اس آبادی کو سمجھ نہیں سکا۔ سفر ٹھیک ہے، مگر صرف دن بھر کا۔ شام ہوتے ہوئے گھر لوٹ آنا چاہیے۔ جیسے پرندے لوٹ آتے ہیں۔
مجن میاں: (حیرت سے) پھر وہی پرندے۔ پرندے۔ (پرخیال انداز میں) مگر پھر مجھ میں لوٹنے کی خواہش کیوں باقی نہیں۔
عارف : شاید اس لیے کہ آپ کا کوئی گھر نہیں تھا؛ آپ ہمیشہ آرام سے رہیں گے مجن چچا بربادی تو ہماری ہے۔
مجن میاں: (ہنستے ہیں) ارے میاں یہ تم کیا بہکی بہکی باتیں کرنے لگے۔
عارف : چائے منگواؤں آپ کے لیے۔
مجن میاں: چائے نہیں؛ کولڈ ڈرنک چل جائے گی۔
(پس منظر سے ہارن کی آواز۔ ٹریفک کا شور)
آصف : یہ کھڑکی بند کردوں بھائی جان؛ اپنے آپ کھل گئی۔
عارف : نہیں کھلی رہنے دو۔ اور مجن چچا کے لیے کوکا کولا کی ایک بوتل لے آؤ۔
مجن میاں: خوب ٹھنڈی۔ ڈیپ فریزر۔ (ہنستے ہیں)
مضحکہ خیز موسیقی
منظر بدلتا ہے۔
(شام کا وقت۔ دور مسجد سے اذان کی آواز سنائی دیتی ہے)
چچا میاں : آموختے کی طرح پڑھتے ہوئے۔ آر۔ او۔ اے۔ ڈی۔ روڈ۔ روڈ معنے سڑک۔ آر۔ او۔ اے ڈی۔ روڈ۔ آر۔ او۔ اے۔ ڈی۔
چچی امی : (قریب آتے ہوئے) واہ بھئی واہ، بڈھے طوطے آسانی سے نہیں سیکھ سکتے۔ تم یہ کیا روڈ

رَوڑ لگائے ہوئے ہو۔

چچامیاں: شہر میں رہنا ہے تو یہ سب سیکھنا ہوگا۔ دیکھ رہی ہو یہ نقشا؛ تمام سڑکوں، علاقوں اور تاریخی جگہوں کے نام لکھے ہوئے ہیں۔

چچی امیّ: (جھکتے ہوئے) اسے ذرا میں بھی تو دیکھوں۔ اپنا عارف کہاں رہتا ہے؛

چچامیاں: (پر اعتماد انداز میں) ابھی بتاتا ہوں۔ یہ دیکھو ۔ یہ رہی کارنوالس روڈ۔ یعنی کہ سڑک! اس کے پیچھے یہ رہابی بی کا مقبرہ ۔ بس مقبرے کے پہلو میں عارف میاں کی بستی ہے۔

چچی امیّ: بستی کا نام کیا ہے؛

چچامیاں: نام تو کچھ بے ڈھنگا ہے۔ سریندر پرتاپ کو۔ لو۔ نی، کو لو۔ نی سمجھیں، کو۔ لو۔ نی کا مطلب ہے بستی۔ نئی بستی ہوگی۔

چچی امیّ: چلو اچھا ہے۔ بستی میں گھر لیا۔ پاس پڑوس آباد ہوگا۔ مگر آبادی کس قوم کے لوگوں کی ہے، کچھ پتا چلا۔

چچامیاں: اب یہ تو اس نقشے میں نہیں لکھا ہے، مگر نام سے کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے سریندر پرتاپ! وہ جو مڈل اسکول کے ایک ماسٹر صاحب ہمارے یہاں آتے ہیں۔ مہیندر پرتاپ۔ وہ تو ٹھاکر ہیں۔ ہوسکتا ہے اس بستی میں زیادہ تر وہی لوگ آباد ہوں شہر کا حال ہمارے یہاں سے بہت الگ ہے۔

چچی امیّ: الگ کیا؛ اے عارف کو گھر لینا تھا تو ایسی جگہ جہاں آس پاس اپنوں کے گھر ہوتے۔ موت زندگی کا کیا بھروسا۔ وقت ناوقت کوئی ضرورت آن پڑے۔

چچامیاں: اسی لیے تو کہتا ہوں کہ تم ان معاملات میں حجت نہ کیا کرو ۔ تم کیا جانو شہر کیا ہوتا ہے۔ وہاں چوڑی چوڑی روڈیں، کولو۔ نیاں۔ یہ سب ہوتا ہے۔ عارف نے لکھا ہے یکے تانگے کچھ قدیمی علاقوں میں چلتے ہیں۔ مگر وہ تو نئے علاقے میں رہتا ہے۔

چچی امی: اسٹیشن سے کتنی دور ہے اس کا گھر؛

چچامیاں: (نقشے پر جھکتے ہوئے) نقشے کے مطابق تو کافی دور ہے۔ عارف نے لکھا تھا اسٹیشن سے گھر تک بس سے کوئی پون گھنٹہ صرف ہوتا ہے۔ قریب قریب اتنا ہی وقت جتنا ہمارے یہاں سے پرتاب گڑھ شہر تک لگتا ہے۔

چچی امیّ: (حیرت سے) اللہ ۔ شہر نہ ہوا ملک ہوگیا۔ بھلا آبادی کیا ہوگی اس شہر کی۔

چچا میاں : بھرا پُرا شہر ہے۔ کچھ نہیں تو تیس چالیس لاکھ نفوس بستے ہوں گے۔

(دروازے پر دستک)

چچی امی : اے ذرا دیکھو تو۔ کون ہے۔ بوا رحیمن۔ اے رحیمن!

رحیمن : (دور سے) آئی بی۔ (آتی ہیں) (دروازے پر دستک)

چچی امی : اے ذرا دیکھو تو کون ہے؟ (جاتی ہیں۔ پھر آتی ہیں)

رحیمن : وہ سلطان میاں کا لونڈا تھا۔ کہ گیا ہے کل ان کی بچی کا عقیقہ ہے۔ دن کے کھانے کا بلاوا ہے۔

چچا میاں : کھانا یعنی کہ دعوت۔ مم مگر۔ یہ سب کیا فضول خرچیاں ہیں۔ ارے کبھی وہ زمانے اب نہیں رہے جب بیس پچیس میں ایک فربہ جانور مل جاتا تھا۔ پتا ہے اب بکرے کا گوشت پندرہ روپے سیر بک رہا ہے۔ خیر بلایا ہے تو چلا جاؤں گا۔

چچی امی : اے گرانی سی گرانی ہے۔ بس آدمی کی جان سستی ہوگئی۔ سبزی ترکاری کے بھاؤ میں پہلے مرغ آجاتا تھا، دیسی گھی اب آنکھ میں لگانے کو بھی مہنگا ہے۔

چچا میاں : میں کہتا ہوں اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کم کھاؤ۔ معمولی کھاؤ۔

چچی امی : تمھاری انہی باتوں سے تو جی الجھتا ہے۔ ابا مرحوم کے زمانے تک گھر میں پانچ پانچ نوکر تھے۔ اب لے دے کے ایک رحیمن۔ روز کھانے پینے میں کیا اہتمام ہوتا تھا۔ اور اب بس پیٹ بھر لیا۔ چوپایوں کی طرح۔

چچا میاں : تو اس میں برائی کیا ہے؟ کیا بزرگوں کی ساری کمائی اڑادوں۔ لٹادوں۔ گنوا دوں سب کچھ! دیکھتی نہیں ہو! اب کبھی حیثیت بنی ہوئی ہے۔ چار پیسے جیب میں ہیں تو دنیا دبتی ہے۔ وجو بھائی کا بیٹا عرب چلا گیا تھا۔ وہاں اس کے کاروبار میں خدا نے برکت دی۔ اب وطن آتا ہے تو دونوں ہاتھوں سے لٹاتا ہے۔ اچھے بھلے طرم خاں جو بنتے تھے اب اس کا حقہ بھرتے ہیں۔ اس کی مصاحبت میں رہتے ہیں۔

چچی امی : بھلا کیا کاروبار ہے اس کا؟

چچا میاں : وہ تو کچھ اور بتاتا ہے۔ مگر زبان خلق کچھ اور کہتی ہے۔

چچی امی : کیا؟ بھلا میں بھی تو سنوں!

چچا میاں : تم نہیں سمجھوگی۔ اسمگلنگ۔ یہ ایک نئی وضع کا کاروبار ہے اور اس میں بڑی

برکت ہے۔ بس ذرا پھنس جانے کا ڈر لگا رہتا ہے۔

چچی امی : کہاں پھنس جانے کا؟

چچا میاں : یہی قانون کا ڈر (لاپروائی سے) مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ پیسا پاس ہو تو سب غلام! قانون بھی غلام۔ لوگ ہاتھ لگاتے گھبراتے ہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ افیون بیچتے ہیں۔ دروازے پر موٹریں جھولتی ہیں۔ ملازموں کی بھیڑ ہے۔ اچھے اچھے سلامی دینے کو حاضر۔

چچی امی : (حسرت آمیز انداز میں) سچ ہے۔ پیسا ہی سب کچھ ہے۔

چچا میاں : کوڑی نہ ہو تو آدمی کوڑی کا تین ہو جاتا ہے۔ سمجھیں! اسی لیے میں نے پھونک پھونک کر قدم رکھا۔ محن میاں کو دیکھو خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ لنڈورے۔ کوئی آگے نہ پیچھے۔ مگر زمانے کا رنگ سمجھتے تھے۔ شہر چلے گئے۔ کتنے تھے کوئی کاروبار سنبھالیں گے۔ گھر کی جمع پونجی اُڑانے پر آتے تو دو چار برس میں سب کچھ ہوا جاتا۔ پیسا تو پکڑنے سے رکتا ہے۔

چچی امی : مگر تمھاری طرح بھی نہ پکڑے اسے کوئی۔ آدمی آرام سے کھا پی تو لے۔

چچا میاں : (بگڑ کر) ہاں ہاں کیوں نہیں۔ تمھارے باوا جان نے اسی کھانے پینے کے چکر میں سب پھونک دیا نا! جہاں دروازے پر ہاتھی جھومتے تھے اب مکھیاں بھنبھناتی ہیں۔

چچی امی : (چمک کر) مکھیاں بھنبھنائیں ان کے دشمنوں کے گھر! ایسا نہ جیسے۔ سانپ لوٹتا تھا لوگوں کے سینے پر جہیز میں گھر بھر گیا تمھارا۔

چچا میاں : (مصالحت کے انداز میں) وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر بی بی۔ میں کہتا ہوں آدمی کو آگے کی بھی کچھ فکر ہونی چاہیے۔ میں نے اگر یہ سب سنبھالا نہ ہوتا تو اپنا حال بھی وہی ہوتا جو ماموں صاحب کا ہوا۔ یہ سہی ہے کہ رئیسانہ جیے۔ مگر موت آئی تو گھر خالی تھا۔ عزیز رشتے دار بھی سب اچھے دنوں کے دوست ہوتے ہیں۔ سوائے ہمارے کسی نے مدد کی ان کی!

چچی امی : (روہانسی ہو کر) تم ہی نے کون سا خزانہ لٹا دیا۔ ابا جانی صبح ناشتے میں ایک مرغ کا شوربہ پیتے تھے۔ تم نے انھیں مہمان رکھا جب بھی یہ توفیق نہیں ہوئی کہ ایک مرغ۔۔۔

چچا میاں : کیا مرغ مرغ لگا رکھا ہے۔ پتا ہے کتنے کا آتا ہے۔ دس روپے کا تو چوزہ ملتا ہے۔

چچی امّی : اور یہ جو اپنے یہاں پلے ہوتے تھے!

چچا میاں : تو کیا سب کٹوا دیتا۔ اری نیک بخت۔ ایک مرغ سے عارف کی ایک مہینے کی اسکول کی فیس ادا ہو جاتی تھی۔

چچی امّی : اور یہ حوصلہ نہیں ہوا کبھی کہ بچّوں کو ایک آدھ بار کھلا بھی دیتے۔ لڑکپن میں عارف کی آنکھوں پر چشمہ چڑھ گیا۔

چچا میاں : تو کیا، چشمہ تو پڑھے لکھے ہونے کی نشانی ہے۔ تمھیں کچھ پتا بھی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین تک چشمہ لگاتے تھے۔ اور وہ مولانا محمد میاں صاحب دیکھا ہے تم نے کیسی موٹی کمان کا چشمہ چڑھائے رہتے ہیں۔ خیر۔ اب یہ قصّہ بند کرو۔ اور یہ بتاؤ کہ کیا کیا انتظام کر لیے ہیں تم نے۔ دالوں کی بوریاں سی لیں۔

چچی امّی : سی لی ہیں، مگر اتنا اسباب جائے گا کیسے؟

چچا میاں : جائے گا کیسے نہیں، میں لے جاؤں گا۔ پتا بھی ہے شہر میں چھے روپے سیر بک رہی ہے۔ ایک بوری بیچ دوں تو سفر کا پورا خرچ نکل آئے۔

چچی امّی : تو کیا اب دالیں بیچو گے۔

چچا میاں : اس میں حرج ہی کیا ہے، کچھ گھر کے لیے رکھ لیں گے۔ کچھ بیچ دیں گے۔

چچی امّی : دنیا کیا کہے گی۔ عارف کیا کہے گا؟

چچا میاں : جس کا جو جی چاہے کہے۔ میں کسی سے دیتا ہوں۔ عارف کو کھلا پلا کر میں نے جوان کیا ہے۔ شہر پہنچ کر اگر ایسا ہی ان کا دماغ خراب ہو گیا ہے تو وہ جانیں۔ گیہوں کے بورے بھی تیار ہیں نا۔ اور ہاں ایک کنستر تیل۔ ایک ٹوکری کھٹائی اور دس پان سیر گُڑ بھی رکھ لینا۔ بس نمک مرچ سبزی ترکاری کی محتاجی ہوگی — وہ خرید لیں گے۔

چچی امّی : یہ سب لے کر جاتے ہوتے اچھا لگے گا، لوگ کیا کہیں گے۔

چچا میاں : کہیں گے کیا، کوئی چوری کا مال ہے؟

چچی امّی : ہمارے ابّا جان نے کبھی چھتری بھی اپنے ہاتھ سے نہیں اُٹھائی۔ ایک خادم ساتھ ساتھ چلتا تھا۔

چچا میاں : اور ہمارے دادا حضور تو رومال بھی اپنی جیب میں رکھنے کے روادار نہ ہوتے تھے جب چھینک آئی ایک مصاحب رومال پیش کر دیتا تھا۔ پھر؟

چچی امیّ : پھر کیا؛ وضع داری بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔
چچا میاں : بھاڑ میں گئی وضع داری زمانے کو دیکھوں کہ ان چونچلوں کو، تمھیں کچھ پتا بھی ہے۔ دلدار نگر کے تعلقہ دار کے گھر کی عورتیں اب چکن کی کڑھائی کر کے پیٹ پالتی ہیں۔
چچی امیّ : خدا نہ کرے۔ اب ایسے دن تو نہیں آئے ہم پر۔
چچا میاں : تمھاری سنتا تو یہ دن بھی آجاتے۔ آج جیب میں چار پیسے ہیں اسی لیے یہمان دان ہے۔ کلکٹر سے ملنے جاتا ہوں تو اُٹھ کر مصافحہ کرتا ہے۔ سرکاری اسپتال کا بڑا ڈاکٹر تھرما میٹر دھوئے بغیر اس خاکسار کے مُنہ میں نہیں دیتا۔ ڈپٹی مزمل صاحب جب دورے پر ادھر آتے ہیں وضو کا لوٹا اسی ڈیوڑھی سے منگواتے ہیں۔
چچی امیّ : اچھا صاحب! تم جیتے میں ہاری۔ اب زبان نہ کھولوں گی۔ جو جی چاہے کرو۔ اپنا کیا ہے، تین چوتھائی گزر گئی۔ باقی دو چار برس تقدیر میں ہیں تو وہ بھی گزر جائیں گے۔
چچا میاں : ہاں ہاں بڑی مصیبتوں میں گزارے ہیں یہ دن تم نے۔
چچی امیّ : تم تو جان کو آگئے۔ میں نے تو سب کچھ ہمیشہ چپ چاپ جھیلا ہے۔
چچا میاں : کیا جھیلا ہے؟ کہو جو جی میں ہو! ذرا سنوں تو!
چچی امیّ : اب مجھے کچھ نہیں کہنا۔ (روہانسی ہو کر) اب کیا کہوں گی۔ کہ کر بھی کیا کر لوں گی۔ (رونے لگتی ہیں۔)

فیڈ آؤٹ

فیڈ ان۔ موسیقی۔ فیڈ آؤٹ

(فیڈ ان: باہر ٹریفک کا شور۔ دور سے آتی ہوئی لاؤڈ اسپیکر پر کسی مقرر کی آواز۔)
مقرر : (جذباتی انداز میں) تو بھائیو اور بہنو! ہم آپ سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہمارا اُدّیشیہ اس دیش کو آرتھک اور اودیوگک اُنتی دینا ہے۔ ہم چاہتے ہیں اس دیش کے کونے کونے میں، ہر گانو میں ہر نگر میں کارکھانے اور ملیں استھاپت ہوں۔ وگیان کی جیوتی گھر گھر پہنچے۔ ہم ایک نئی پرمپرا کو پُرو تساہت کریں۔ گریبی اور اندھ وشواس سے ہمیں چھٹکارا مل جائے۔ پشچم کے مہانگروں میں جو کُھش حالی دکھائی دیتی ہے وہ گانو گانو میں پھیل جائے۔ ہم مل جل کر ایک نئے بھوشیہ کی اور بڑھیں۔ (مقرر کی آواز تالیوں میں ڈوب جاتی ہے۔)

(اسی وقت کال بیل بجتی ہے۔ اندر عارف ٹیپ ریکارڈ پر ایک گیت سن رہا ہے۔ دھیرے دھیرے باہر کی آواز ٹیپ ریکارڈ میں دب جاتی ہے۔ کال بیل پھر بجتی ہے ——)

عارف : آصف! اے آصف! ذرا دیکھو تو۔

(آصف جاتا ہے۔ دروازہ کھلتا ہے اور پھر مجن میاں اور آصف ساتھ ساتھ اندر آتے ہیں۔ عارف گیت سن رہا ہے۔)

مجن میاں: (کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے) بھئی واہ! میاں باہر اس زور و شور کی تقریر ہو رہی تھی اور تم یہاں بکواس سن رہے ہو۔

عارف : تقریر؟

(ٹیپ ریکارڈر کی آواز دھیمی کر دیتا ہے)

مجن میاں: ہاں میاں! کیا شعلہ بیان مقرر تھا۔ کہتا تھا ہمیں اپنی تمام بیل گاڑیوں کو ٹرکوں میں تبدیل کرنا ہے۔ یکّوں کی جگہ ملک کے کونے کونے میں ٹیکسیاں چلیں گی۔ کنوئیں کے غلیظ پانی کی جگہ سب کو نلوں کا پانی ملے گا۔

عارف : (پُر خیال انداز میں) کب تک؟ (ہنستا ہے) اور یہ سب پانے کے لیے جو کچھ کھونا پڑے گا اس کا کسی کو خیال نہیں؟

مجن میاں: میاں گھاس تو نہیں کھا گئے ہو؟ یہ سب مل جائے تو پھر ضرورت ہی کس چیز کی رہ جائے گی؟

عارف : گاڑی بانوں کے گیت اور پنگھٹ اور پٹرول کی بو اور دھوئیں سے آزاد فضا!

مجن میاں: اے میاں ہوش کی باتیں کرو، پڑھ لکھ کر الٹی منطقیں بگھار رہے ہو۔

عارف : یہ زمانہ ہی الٹی منطق کا ہے چچا۔ الٹی ترقی۔ اُلٹے آدرش۔ الٹی باتیں۔ خیر چھوڑیے اس قصے کو۔

مجن میاں: نہیں ہرگز نہیں۔ تم مجھے قایل کر دو! مان جاؤں گا!

عارف : میں بھلا آپ کو کیسے قایل کر سکتا ہوں۔

مجن میاں: کیوں؟ قایل کیوں نہیں کرتے؟

عارف : (ایک ٹھنڈی سانس لے کر) آپ عمر میں ہی نہیں ہر معاملے میں مجھ سے آگے ہیں

(ٹیپ ریکاڈر بند کر دیتا ہے۔ باہر سڑک پر گزرتی ہوئی کسی موٹر کا ہارن چیختا ہے)
اور شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں مجن چچا۔ میں ہی غلطی پر ہوں۔

مجن میاں : (خوش ہو کر) مان گئے نا! میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا۔ بھائی سائنس کا زمانہ ہے، مشینوں، کارخانوں کا زمانہ ہے۔

عارف : ہاں! اور آدمی دھیرے دھیرے پیچھے ہٹتا جا رہا ہے۔ جی ہاں! آدمی پیچھے ہٹتا جا رہا ہے۔

مجن میاں : (کھی کھی کرتے ہوئے ہنستے ہیں) پیچھے! اماں تو کیا ساری چیزیں آسمان سے ٹپکتی ہیں؟ آخر خدا نے آدمی کو جو عقل کی دولت دی ہے۔ کیا یہ سب اس کا کرشمہ نہیں ہے؟

عارف : (ہنس کر) کرشمہ نہیں فتنہ کہیے۔

مجن میاں : دیکھو میاں! پھر تم نے بات ہنسی میں اڑا دی۔

عارف : (سنجیدگی سے) یہی تو ستم ہوا مجن چچا کہ آدمی نے مشینیں بنائیں اور پھر ان کا محکوم ہو گیا۔ خیر جانے دیجیے۔ اپنی کہیے۔

مجن میاں : موٹریں تو خریدلیں۔ دو عدد ــ چالیس ہزار میں۔ بس معمولی اوور ہالنگ کی ضرورت ہے۔ اب تم لائسنس دلوا دو جلدی سے آج دلوا دو، کل ہی سے چالو ہو جائیں گی۔ میرے عزیز، وہی جن کے ہاں میں ٹھہرا ہوا ہوں، کہتے تھے کہ ڈرائیور بھی ہاتھ کے ہاتھ مل جائیں گے۔

عارف : تو آپ بھی اب ایک دم شہری آدمی بن گئے۔

مجن میاں : میاں یہ کہو کہ آدمی بن گیا۔ میری شامت کہ اتنے دنوں بعد ہوش آیا۔ یہ فیصلہ پہلے ہی کر لیا ہوتا تو آج کاروبار جم چکا ہوتا۔ خیر ــ اب بھی کون سی دیر ہوئی ہے۔ میرے وہ عزیز دس برس پہلے شہر میں آئے تھے۔ موٹر میکینک بن گئے۔ پھر ٹیکسی ڈرائیور بن گئے۔ پھر اب ٹیکسیوں کے مالک ہیں، ایک نہ دو پوری چار گاڑیاں ان کے پاس ہیں اور چھ عدد اسکوٹر رکشے۔ ٹھاٹ ہیں۔ گاؤں میں تھے تو ایک گھوڑی پالنے کی حیثیت بھی نہیں تھی۔

عارف : (اکتا کر) کل صبح آپ دفتر آ جائیے۔ خانہ پُری کا کام پورا ہو جاتے پھر دیکھتے ہیں۔

مجن میاں : (رازدارانہ لہجے میں) میاں کچھ خرچ کرنے کی ضرورت آجائے تو اس کے لیے بھی تیار ہوں۔ یوں تو جانتا ہوں کہ تمھارے رہتے ہوئے اس کی ضرورت نہ پڑے گی۔ ماشاء اللہ تمھارے تعلقات افسروں سے ہیں۔ مگر تم جانو! پیسے کی ضرورت کسے نہیں ہوتی۔ پھر تنخواہ دار ملازم۔ گنی بوٹی نپا شوربہ۔ کوئی کچھ مانگ ہی بیٹھے تو پیچھے مت ہٹنا۔ خدا کا دیا ہوا اپنی جھولی میں جو کچھ بھی ہے کس دن کام آئے گا۔

عارف : (اکتاکر) ٹھیک ہے، آپ چائے پئیں گے۔

مجن میاں : چائے۔ خیر چائے ہی پی لیں گے! اور لائسنس مل جائے تو پھر ایک شاندار دعوت۔ کیا کہتے ہیں ڈنر۔ لاؤ ہاتھ! (ہنستے ہیں)

عارف : (بیچارگی کے انداز میں) ٹھیک ہے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ (آصف سے) آصف! چائے بناؤ!

مجن میاں : دیکھو بھائی! یہ غلط ہے۔ خود چائے بنائی ہے تو پھر نیچے دکان سے کوکاکولا منگوالو! یہ تم کوئی ملازم کیوں نہیں رکھ لیتے۔

عارف : (ہنس کر) ملازم! آپ کو پتا بھی ہے ایک ملازم رکھنے پر کیا خرچ اُٹھے گا؟

مجن میاں : (سوچتے ہوئے) ہوں ں ں ں۔ یہ بات تو ہے۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ میرے پارٹنر بن جاؤ۔ ایک موٹر اور خرید لیتے ہیں۔ حساب کتاب میں دیکھوں گا۔ دفتر کچہری تمھارے ذمے۔ میرے عزیز کہتے ہیں اس کاروبار میں یہ چکر بہت ہوتا ہے۔

عارف : میں اس لائق کب ہوں مجن چچا۔ یہ ملازمت ہی بہت ہے۔ (آصف سے) آصف! مجن چچا کے لیے ڈرنک لے آؤ!

آصف : جی اچھا! (آصف جاتا ہے)

مجن میاں : اور بھائی صاحب اور بھابھی صاحبہ کب آرہے ہیں؟ کون سا دن بتایا تھا تم نے؟

عارف : جمعہ کی صبح کو۔

مجن میاں : یعنی کہ پرسوں نہیں ترسوں!

عارف : ہاں!

مجن میاں : بھئی واہ۔ کل لائسنس مل جائے تو مزا آجائے۔ اپنی ٹیکسیاں لے کر اسٹیشن چلیں گے۔

عارف : آپ اس کی فکر نہ کیجیے۔ وہ انتظام ہو جائے گا!

مجن میاں : (کھسیا کر) وہ تو ہو ہی جائے گا۔ مگر میں تو چاہتا ہوں اسی روز ہماری ٹیکسیوں کا افتتاح ہو جائے۔

(آصف کولڈ ڈرنک کی بوتل لے آتا ہے۔ مجن میاں کو دیتا ہے۔)

مجن میاں: صرف میرے لیے؟

عارف : ہم لوگ ابھی ابھی چائے پی چکے ہیں۔

مجن میاں: (ہنس کر) خیر، کوئی بات نہیں! میں تو سمجھا کہ تم بھی بھائی صاحب کی طرح ذرا اقتصادی آدمی ہو!

عارف : اقتصادی آدمی؟

مجن میاں: میرا مطلب ہے کفایت شعار۔ (ہنس کر) ارے بھائی۔ تنخواہ دار آدمی کو ہونا ہی پڑتا ہے۔ مہنگائی بھی تو غضب کی ہے۔ مکھن کی سو گرام کی ٹکیہ چار روپے کی۔ خدا کی پناہ (پھر ہنستے ہیں) مگر مکھن بازی کا رواج بڑھتا جاتا ہے۔ میاں اب تو نوکری میں بھی ترقی چاہیے ہو تو مکھن بازی کرنی پڑے گی۔

عارف : (بیزاری سے) معاف کیجیے گا مجن چچا۔ میں آج بہت تھکا ہوا ہوں۔

مجن میاں: ارے بھائی تو پہلے کیوں نہیں بتایا؟ خیر! میں چلتا ہوں۔ (اٹھتے ہیں) کل صبح ٹھیک دس بجے تمھارے دفتر میں حاضری دوں گا۔ (جاتے ہیں)

عارف : (خود کلامی کے انداز میں) الو کے پٹھے!

آصف : آپ نے کچھ کہا بھائی جان!

عارف : (چونک کر) نن نہیں! تم جاؤ اپنا کام کرو۔ (آصف چلا جاتا ہے۔)

عارف : (اپنے آپ سے) یہ کیسا تماشہ ہے۔ لوگ بدل جاتے ہیں۔ یا بدلتے نہیں، بس بدلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں؟ یہ دوسری زندگی گزار رہے تھے؟ یا یہ کہ ان کا سفر ہمیشہ ایک ہی سمت میں ہوتا ہے۔ آگے۔ اور آگے۔ اور آگے۔ پرندے شام تک اپنے بسیروں کو لوٹ آتے ہیں۔ مگر یہ لوگ۔ ہر صبح کے ساتھ اور آگے

بڑھتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ واپسی کا خیال بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اس شہر میں کتنی سڑکیں ہیں، اور کتنے چوراہے ۔ اور ہر چوراہے سے نکلنے والی سڑک ایک دوسرے چوراہے میں گم ہو جاتی ہے۔ یہ کیسا جال ہے۔ ایک سلسلہ۔ سازش۔ راستوں کی سازش۔ پورب، پچھم، اتر، دکھن۔ اب کوئی سڑک اُن بستیوں کی طرف نہیں جاتی جہاں بکّے چلتے ہیں اور دُھول اڑتی ہے اور جہاں کوئلیں کوکتی ہیں۔ وہ ساری کچّی سڑکیں دھیرے دھیرے شہر کے راستوں میں گم ہوتی جاتی ہیں۔۔۔

(ٹیپ ریکارڈر آن کر دیتا ہے۔ بھجن کی دُھن اور بول رفتہ رفتہ نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔)

کون ٹھگوا نگریا لوٹل ہو
کون ٹھگوا نگریا لوٹل ہو
جگ سے ناتا ٹوٹل ہو
کون ٹھگوا . . . .

فیڈ آؤٹ

منظر بدلتا ہے

(اسٹیشن کا شور۔ گاڑی آتی ہے۔ شور)

(اسی شور کے پس منظر میں)

چچا میاں: بھئی واہ! مجن میاں بھی یہیں ہیں!

مجن میاں: جناب! عارف میاں کی کوششوں سے لائسنس مل گیا۔

چچا میاں: لائسنس؟

مجن میاں: جی جناب۔ دو ٹیکسیوں کا۔ یہ خاکسار خدمت کے لیے حاضر ہے۔ آپ کو اپنی ہی گاڑی پر گھر لے چلیں گے۔

عارف: آپ لوگوں کا سفر تو اچھا رہا؟

چچا میاں: ہاں بیٹے! بس تمہاری چچی ذرا نڈھال ہو گئیں۔ سفر لمبا تھا! مگر لمبا بھی کتنا۔ ایک رات!

عارف : آپ تو لگتا ہے پورا گھر یہاں اُٹھا لائے۔
چچامیاں: بھائی گھر کی چیزیں تھیں۔ ہم۔ ، سوچا لیتے چلیں۔
عارف : اور وہ کبوتروں کی جوڑی؟
چچامیاں: اوہ! ہاں۔ پہلے تو سوچا تھا۔ مگر پھر خیال آیا کہ اُلجھن رہے گی۔ ظہیر میاں کے سپرد کر آیا۔
مجن میاں: اچھا ہی کیا آپ نے! یہاں کبوتروں کا کیا ذکر، آدمی کے لیے جگہ مشکل سے ملتی ہے۔ دو کمروں کا فلیٹ ہے۔ عارف میاں کا۔
چچامیاں: میاں اب آ گئے ہیں تو سب جھیل جائیں گے۔ رفتہ رفتہ عادت ہو جائے گی۔ یہ اچھا ہے کہ تم بھی ہو۔ شام کو شطرنج بچھے گی۔
مجن میاں: (ہنس کر) اب خلیل خاں کے فاختہ اڑانے کا زمانہ گزر گیا بھائی صاحب! جب سے آیا ہوں لگتا ہے مرنے کی بھی فرصت مشکل ہی سے ملے گی۔ ایسی بھاگم بھاگ ہے کہ کیا بتاؤں؟ مگر سچ پوچھیے تو یہی زندگی ہے۔
عارف : (اکتا کر) اب آگے بڑھیں۔ گھر چل کر باتیں ہوں گی۔ (پکارتے ہوئے) قلی! او قلی!
چچامیاں: عارف میاں کچھ ہم بھی اُٹھا لیتے ہیں۔
عارف : پھر بھی! کم سے کم تین قلیوں کی ضرورت پڑے گی۔
چچامیاں: آج تمھاری چھٹی ہے ___؟
عارف : جی نہیں! پہلے تو سوچا تھا آصف کو بھیج دوں۔ مگر اچانک اسے ایک مصروفیت نکل آئی۔ میں نے آج چھٹی لے لی۔ (قلی سے) قلی! تم ___ تم یہ گٹھر اٹھاؤ! آیئے۔
چچامیاں: دیکھو! کچھ چھوٹ تو نہیں گیا!
مجن میاں: ہاں میاں! اچھی طرح گن لو ___ ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھے، چھے عدد تو قلیوں کے ساتھ ہیں۔ یہ سامان ایک ایک دو دو ہم اٹھا لیتے ہیں ___ چلو!

(اسٹیشن کا شور غالب آجاتا ہے)

فیڈ آؤٹ

موسیقی

(منظر بدلتا ہے)

چچامیاں: (کھانستے ہوئے) ارے بھئی سنتی ہو! ارے بھئی میں نے کہا سنتی ہو۔
چچی امی: (دور سے) آرہی ہوں، آرہی ہوں۔ (بڑبڑاتے ہوئے قریب آتی ہیں) تمھاری تو عادت ہے گلا پھاڑنے کی۔ دو بالشت کا گھر۔ یہاں اس کی ضرورت کیا ہے؟ کیا ہے؟ کس واسطے چیخ رہے تھے؟
چچامیاں: ٹھیک سے بیٹھو تو کہوں! (بیٹھ جاتی ہیں)
چچامیاں: ہفتہ بھر ہو گیا آئے ہوئے۔
چچی امی: مجھے معلوم ہے پھر۔؟
چچامیاں: پُررونق شہر ہے۔
چچی امی: (اسی انداز میں) وہ تو دیکھ رہی ہوں، پھر؟
چچامیاں: عارف نے گھر بھی اچھی جگہ لیا ہے۔ رات گئے تک چوراہہ آباد رہتا ہے۔ وہاں کتنا سناٹا تھا۔ سرِشام ہی بستی پر مردنی چھا جاتی تھی۔
چچی امی: (کچھ سوچ کر) مگر مجھے تو یہاں ہول اٹھتا ہے۔ جی الجھتا ہے۔
چچامیاں: اصل میں گھر چھوٹا ہے ذرا۔
چچی امی: تو بدل لو!
چچامیاں: بدل لوں: مگر کیسے؛ عارف کی تنخواہ۔
چچی امی: عارف کی تنخواہ ہی پر بھروسا کیوں ہے۔ خدا کا دیا ہوا۔۔۔
چچامیاں: (بات کاٹ کر) اگر اسے ابھی سے اُڑانا شروع کر دیا تو کے دن کام چلے گا۔
چچی امی: پھر چپ بیٹھو۔
چچامیاں: (پرخیال انداز میں) ہوں ں ں ں۔ میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔
چچی امی: کیا؟
چچامیاں: یہ کہ کیوں نہ کوئی کام سنبھال لوں۔
چچی امی: تمھیں یہاں کون سی نوکری مل جائے گی۔ پھر اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔
چچامیاں: ضرورت۔ ضرورت کیوں نہیں۔ تو کیا عمر بھر اس گھروندے میں بند رہیں۔ ذرا دیکھو۔ چاروں طرف کیسی کیسی شاندار عمارتیں ہیں۔ ابھی کل ہی میں مجیب میاں کے گھر گیا تھا۔ آصف کو لے کر۔ یہاں سے کوئی چار پانچ میل کے فاصلے پہ۔ جارج ٹاؤن

نامی بستی میں رہتے ہیں۔ اپنی کوٹھی بنوالی ہے۔ ارے وہی مجیب میاں مرادآباد والے۔

چچی امی : پھر؛

چچامیاں : پھر کیا؛ وہ مرادآبادی برتن اور بھانت بھانت کی فینسی چیزیں ولایت بھیجتے ہیں۔ ہزاروں کی یافت ہے۔ دسیوں تو ان کے کارندے ہیں۔ خدا نے بڑی برکت دی۔

چچی امی : پھر؛

چچامیاں : افوہ! تم تو بس پھر پھر لگائے ہوئے ہو۔ میں سوچتا ہوں میں بھی یہی کام شروع کردوں۔ ایکسپورٹ لائسنس لینا ہوگا۔

چچی امی : ایکسپورٹ۔ کیا کہا؛ کیا لینا ہوگا؛

چچامیاں : سرکاری اجازت نامہ سمجھو۔ میں نے ساری معلومات جمع کرلی ہیں۔

[کال بیل بجتی ہے]

چچامیاں : یہ ناوقت کون آمرا۔ آصف ابھی تک آیا نہیں۔ اور عارف کیا کررہا ہے؛

چچی امی : دوسرے کمرے میں لیٹا ہے۔ عارف۔ او عارف! ذرا دیکھو تو بیٹا کوئی ہے؛

[عارف دروازہ کھولتا ہے۔ مجن میاں اندر آتے ہیں]

عارف : (باہر سے) مجن چچا ہیں۔

چچامیاں : تم ہٹ جاؤ۔ مجن میاں آئے ہیں۔

[چچی امی دوسرے کمرے میں جاتی ہیں]

چچامیاں : آؤ آؤ بھائی مجن میاں۔ خوب آئے۔

مجن میاں : آداب عرض بھائی صاحب!

چچامیاں : آداب عرض۔ تسلیمات۔ آؤ آؤ!

[مجن میاں بیٹھ جاتے ہیں]

چچامیاں : عارف! بیٹے تم بھی بیٹھو، ایک ضروری مشورہ کرنا ہے۔

عارف : جی اچھا۔ (بیٹھ جاتا ہے)

چچامیاں : (رازدارانہ انداز میں) کل میں مجیب میاں کے گھر گیا تھا نا آصف کے ساتھ۔

عارف : جی !

چچامیاں: ماشاء اللہ کیا شاندار کاروبار جمایا ہے محل ہے محل۔ بڑے بیٹے کو امریکہ بھیج دیا ہے۔

عارف : جی !

مجن میاں: امریکہ۔ بہت خوب۔ صاحب۔ امریکہ کی بھی کیا بات ہے۔ فسٹ نمبر ہے اس ملک کا۔

چچامیاں : سوچتا ہوں آصف کو بھی بھیج دوں۔ کیوں عارف!

عارف : بہت اچھا ہے۔ مگر ابھی اس کا جانا۔ دو سال بعد ہی ٹھیک ہوگا۔

چچامیاں : دو سال کیوں؟

عارف : ایم۔ اے کا کورس پورا ہونے میں دو سال لگیں گے۔

چچامیاں : ارے میاں کیا رکھا ہے ایم۔ اے میں۔ کتنا کمالے گا ایم۔ اے کرکے۔

مجن میاں: ٹھیک کہتے ہیں بھائی صاحب! کیا رکھا ہے ایم۔ اے میں۔

عارف : میں کچھ سمجھ نہیں سکا۔

چچامیاں: وہی تو سمجھا رہا ہوں میاں! وہ مجیب میاں مراد آبادی برتنوں کا ایکسپورٹ کرتے ہیں۔ سمجھو عیش کرتے ہیں۔ بڑے بیٹے کو بھی اسی کاروبار میں لگا لیا ہے۔ پہلے تو بس وہ سال دو سال پر وہاں جاتا تھا اور اپنے سامان کا آرڈر لاتا تھا۔ اب وہیں بس گیا ہے۔ وہاں دکان کھول لی ہے۔

عارف : تو آصف کیا کریں گے وہاں۔

چچامیاں: ارے میاں کوئی ابھی تھوڑے ہی بھیجے دے رہا ہوں۔ ابھی تو پہلے یہاں کاروبار جمانا ہے۔ پھر خدا نے چاہا تو وہ دن بھی آجائے گا۔

مجن میاں: (جلدی سے) جب ہمارے آصف میاں امریکہ جابسیں۔

چچامیاں: انشاء اللہ العزیز۔

مجن میاں: اور سچ پوچھیے تو آپ کی حیثیت بھی۔

چچامیاں : (جلدی سے) بھائی مجن میاں حیثیت تو بنانے سے بنتی ہے۔ مانا کہ مجیب میاں گھر کے کھاتے پیتے آسودہ حال تھے مگر اب تو دولت کی ریل پیل ہے۔ دیکھئے

دیکھتے کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ جب وہ کر سکتے ہیں تو ہم بھی کر سکتے ہیں۔

مجن میاں: انشاء اللہ۔ انشاء اللہ!

چچا میاں: تو بیٹے عارف!

عارف: جی!

چچا میاں: ایکسپورٹ لائسنس کی جگاڑ کرو۔

مجن میاں: ارے بھائی صاحب! یہ تو عارف میاں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوگا۔ ماشاء اللہ سے وسیع تعلقات ۔ پھر ذہانت، فطانت، متانت۔ بس ذرا محنت کرنی پڑے گی۔

چچا میاں: میں نے سب معلومات یکجا کرلی ہیں۔ (رازدارانہ انداز میں) مجیب میاں کا ایک پرانا کارندہ بھی واقف کار نکلا۔ واقف کار کیا، سمجھو کہ لنگوٹیا یار تھا، اس کے باپ میں اور میرے تایا مرحوم میں بڑا یارانہ تھا۔ تایا مرحوم کے گھر جب بھی جاتے ہیں اور وہ خوب دھومیں مچاتے۔ پاس پاس حویلیاں تھیں۔ اور کارندہ بن کے رہ گیا غریب۔ باپ نے ساری دولت جائداد ناعاقبت اندیشی میں اڑا دی۔ وہ تو کہو کہ دو حرف پڑھ لیے تھے جو آج کارندہ بھی بن گیا ہے نہیں تو۔

مجن میاں: (آہ بھر کر) ہاں بھائی صاحب ۔ دنیا بڑی بے اعتبار جگہ ہے۔

چچا میاں: تو پھر عارف میاں! تم کل ہی سے بھاگ دوڑ شروع کردو۔ خدا نے چاہا تو اپنے آصف میاں بھی ایک روز امریکہ پہنچ جائیں گے۔

مجن میاں: ان سے ایک مسالہ پیسنے کی مشین منگوانی ہے مجھے۔ صاحب امریکیوں کا بھی جواب نہیں! کیا چیزیں بناتے ہیں۔ آصف میاں سے کہوں گا کہ ۔ ۔ ۔ ۔

چچا میاں: (جلدی سے) ارے بھائی پہلے وقت تو آنے دو۔ سب کچھ منگوا لینا۔ ٹیلی ویژن، ٹرین زسٹر، ریڈیو گرام۔ مجیب میاں کے ہاں کیا کیا عجائبات جمع ہیں۔ میری تو آنکھیں کھل گئیں۔

مجن میاں: جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی ۔ کیا بات کہی ہے شاعر نے موقع کی!

چچا میاں: ارے صاحب! (پرجوش انداز میں) اسی لیے تو آج رشیا بھی امریکہ کا لوہا مانتا ہے۔ ویسے رشیا بھی آگے جا چکا ہے۔ اپنی کتیا تک چاند پر بھیج دی ۔

دونوں میں خوب لاگ ڈانٹ رہتی ہے۔ کیوں بیٹے۔ ہے نا؟

عارف : جی! (رک کر) تو میں چائے بنوادوں آپ دونوں کے لیے۔

چچا میاں : ارے میاں بیٹھو تو دو گھڑی۔ میں چاہتا ہوں بات آج طے ہو جائے۔

محبن میاں: طے کیا کرنا بھائی صاحب! پیسا ہاتھ میں اور دماغ ذرا چلتا ہو تو کاروبار جمنے میں کیا دیر لگتی ہے۔ مجھی کو دیکھیے۔

چچا میاں : تمھیں کتنی یافت ہو جاتی ہے روزانہ۔

محبن میاں: کم سے کم ڈیڑھ سو۔

چچا میاں : گویا کہ ڈیڑھ سو کو تیس سے ضرب دو تو۔ کتنا ہوا، کتنا ہوا ساڑھے چار ہزار؟

محبن میاں: (اترا کر) جناب!

چچا میاں : (مرعوب ہو کر) کمال ہے بھئی، ساڑھے چار ہزار۔ تو کیوں نہ میں ٹیکسیوں ہی کا کاروبار جما لوں۔

محبن میاں: ہاں ہاں کیوں نہیں؛ اور چاہیں تو کسی چلتی ہوئی چیز کی ایجنسی لے لیں۔

چچا میاں: ایجنسی۔ یہ کیا چیز ہے؟

محبن میاں: مگر اس میں پہلے دکان کے لیے جگہ کا چکر ہوگا۔

چچا میاں: جگہ تو مل ہی سکتی ہے۔ مگر یہ ایجنسی کیا بلا ہے؟

محبن میاں: یہ سمجھ لیجیے کہ جیسے کارخانے ہیں۔ چیزیں تیار کرتے ہیں۔ صابن ٹوتھ پیسٹ، پلاسٹک کی چیزیں۔ یا جیسے بلب، پنکھے، ریڈیو۔ ہزاروں چیزیں ہیں۔

چچا میاں: ہاں ہاں؛ سمجھ رہا ہوں۔ پھر؟

عارف : (اکتا کر) میں چائے بنوا دوں۔

چچا میاں: ہاں ہاں؛ جاؤ! جب تک میں محبن میاں کی بات سنتا ہوں۔ ہاں تو جیسے بلب، ریڈیو، پنکھے ہزاروں یعنی کہ ہزاروں چیزیں ہیں۔

(عارف اٹھتا ہے اور باہر نکل جاتا ہے)

چچا میاں : اور بیٹے! ذرا چار مینار سگریٹ کی ایک ڈبیا بھی منگوا دو۔

عارف : (باہر سے) جی اچھا!

(پس منظر سے ٹریفک کا شور ابھرتا ہے۔ اس شور کے ساتھ لرزہ خیز

موسیقی کی ایک لہر اُبھرتی ہے پھر ڈوب جاتی ہے۔)

وقفہ

فیڈ ان:

چچی امی : بیٹے آصف!

آصف : جی چچی امی!

چچی امی : یہ عارف دفتر سے لوٹ کر کمرے میں بند ہو جاتا ہے۔ پہلے شام کو کھلی ہوا میں چھت پر بیٹھتا تھا۔ اب جب دیکھو کمرے میں۔

آصف : تو کیا بلا دیں انھیں۔

چچی امی : نہیں۔ آرام کرنے دو۔ مگر آخر بات کیا ہے بیٹے!

آصف : یہاں کھلی چھت تو ہے نہیں!

چچی امی : پھر کہیں باہر ہی ہو آیا کرے۔ گھڑی دو گھڑی دوستوں میں ہنس بول لے۔ میں نے اسے کسی کے ہاں آتے جاتے کبھی نہیں دیکھا۔

آصف : (متانت سے) بھائی جان بس اپنے ساتھ رہتے ہیں اور شاید ٹھیک ہی کرتے ہیں!

چچی امی : ایں!

آصف : جی کچھ نہیں!

چچی امی : کمرے میں بند کیا کرتا رہتا ہے۔

آصف : گیت سنتے رہتے ہیں۔

چچی امی : یہ نیا شوق لگا ہے اسے۔ گاؤں میں تو یہ شوق نہیں تھا۔

آصف : وہاں پرندے تھے۔ (دھیرے سے) اور خاموشی!

چچی امی : ایں؟ کیا کہا؟

آصف : تھک جاتے ہیں دن بھر۔ بھائی جان کا مزاج ہی کچھ دوسرا ہے۔

چچی امی : میں تو سمجھتی ہوں اس کا جی یہاں لگتا نہیں۔ چپ چپ۔ تمھارے باوا اب کاروبار کی دھن میں لگ گئے ہیں۔ مجن میاں اپنے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں۔ عجب افراتفری ہے۔ سب پیسے کے غلام۔ یا اللہ یہ کیسی ہوس ہے!

(کال بیل بجتی ہے)

آصف : (چلاکر) آیا! حاضر ہوا۔ (جاتا ہے)

(دروازہ کھلتا ہے۔ چچامیاں اندر آتے ہیں)

چچامیاں: (ہانپتے ہوئے) آج تو جان ہی لے لی اس چکر نے (بیٹھ کر کھانستے ہیں) ذرا پانی لاؤ بیٹے!

آصف : جی اچھا! (جاتا ہے۔ پھر آتا ہے)

چچی امی : کچھ کھالو تو پانی پیو!

چچامیاں: نہیں! بھوک قطعاً نہیں۔ دن میں وہیں دفتر کے سامنے ایک اسٹال پر وہ کیا کہتے ہیں دو چھولے بھٹورے کھالیے تھے۔ مزے کی چیز تھی۔ (ہانپتے ہوئے) خیر خدا کا شکر ہے کہ کام آدھا تو ہو گیا۔

چچی امی : مگر ایسا بھی کیا کام کہ آدمی ہلکان ہو جائے۔

چچامیاں: (غٹ غٹ پانی پیتے ہیں) ارے دیکھ لینا خدا نے چاہا تو سال دو سال میں کاروبار چمک اُٹھے گا، میں تو کہتا ہوں بس ذرا چل نکلے تو آصف کو امریکہ بھیجتا ہوں۔ ایک چکّر تو لگا ہی آئے۔ اور کاروبار کا تو یہ ہے کہ اشرف صاحب، وہی جن کے یہاں مجیب میاں کا سمدھیانا ہے، کسی زمانے میں بندر پکڑوا کر ولایت بھیجا کرتے تھے۔ خدا نے اسی میں برکت دے دی۔ اب اچھا خاصا چڑیا گھر جمالیا ہے۔ سانپ، بچھو، مینڈھک، بندر، چوہے، خرگوش، مچھلیاں قسم قسم کے جانور بیچتے ہیں۔

چچی امی : سانپ، بچھو، بندر، چوہے، مینڈھک یہ خریدتا کون ہے۔

چچامیاں: تم کیا جانو۔ بڑے بڑے اعلا کالجوں بلکہ یونیورسٹیوں میں ان کی کھپت ہے۔ طلبہ طالبات ان پر عجیب تجربات کرتے ہیں۔ چیر پھاڑ کرتے ہیں۔ جبھی تو ڈاکٹر بنتے ہیں۔ کیوں آصف!

آصف : جی!

چچامیاں: میں نے مرادآبادی برتنوں کا ارادہ چھوڑ دیا۔ سوچتا ہوں کپڑے سلوا کر باہر بھجواؤں۔

چچی امیّ : کس کے کپڑے؟

چچا میاں: لوگوں کے پہننے کے لیے ،تم کیا جانو؟ گارمینٹ ایکسپورٹ کا بہت چلن ہے ان دنوں! کوئی درجن بھر درزی تو اپنی ہی طرف کے یہاں لگے ہوئے ہیں. میں نے سب پتا کرلیا ہے۔

چچی امیّ : یہ دن بھر جو مارے پھرتے رہتے ہیں تو کیا...

چچا میاں: (جھنجھلاکر جلدی سے) تم اسے مارا مارا پھرنا کہتی ہو۔ مجھے لائسنس بھی مل گیا۔ اب دیکھنا بس دو چار دنوں میں ۔کیوں آصف!

آصف : جی!

چچا میاں: عارف میاں ہیں کہاں؟ دفتر سے تو آ گئے ہوں گے۔

آصف : کمرے میں ہیں۔ بلالاؤں!

چچا میاں: ہاں ہاں بلاؤ! ذرا ان سے مشورہ تو کروں۔

(آصف جاتا ہے۔ پھر آتا ہے)

چچی امیّ : کیوں کیا ہوا؟

آصف : بھائی جان شاید کہیں چلے گئے ہیں۔ آس پاس کہیں چلے گئے ہوں گے، کسی ضرورت سے۔

چچی امیّ : کب نکل گیا چپکے سے؟ خبر بھی نہیں ہوئی۔

آصف : میں نے کچھ آہٹ تو سُنی تھی۔ مگر دھیان نہیں دیا۔

چچا میاں: چلے گئے ہوں گے کہیں گھومنے پھرنے۔ اچھا ہے۔ آجائیں گے ابھی۔ بچے تھوڑی ہیں۔

(کال بیل بجتی ہے۔ آصف دروازہ کھولتا ہے ملے جلے قدموں کی آوازیں قریب آتی ہوئی)

آصف : (باہر سے) مجن چچا ہیں۔

چچا میاں: بھئی واہ، خوب آئے، بیگم تم اندر جاؤ۔ (چچی امیّ جاتی ہیں) آؤ بھئی مجن میاں آؤ۔ موقعے سے آئے۔

مجن میاں: آداب عرض بھائی صاحب!

چچا میاں: آداب، کتنے دنوں بعد صورت دکھائی۔

مجن میاں: کیا کہوں بھائی صاحب! فرصت ہی نہیں ملتی، کئی منصوبے ہیں۔ انہی کی ادھیڑ بن میں لگا رہتا ہوں۔ پھر فاصلے۔

چچا میاں: تمھارا گھر بھلا کتنی دور ہوگا یہاں سے۔

مجن میاں: کم سے کم دس میل۔ خدا کا شکر ہے گھر اچھا مل گیا۔

چچا میاں: خدا کا شکر ہے۔

مجن میاں: سوچا دو چار کرسیاں پلنگ ڈال لوں۔ گھر گرہستی کے انتظام میں کوئی اور تو ہاتھ بٹانے والا ہے نہیں۔

چچا میاں: ہو جائے گا، سب ہو جائے گا (آصف سے) بیٹے آصف! ذرا چائے بنوا دو!

آصف: جی اچھا! (جاتا ہے)

چچا میاں: بھائی میں نے ایک اور بات سوچی ہے۔ وہ مراد آبادی برتنوں کا کام بعد میں سوچیں گے۔

مجن میاں: پھر؟

چچا میاں: سوچتا ہوں گارمینٹ ایکسپورٹ۔

مجن میاں: (جلدی سے) بہت خوب۔ بہت خوب۔ کیا بات آئی ہے ذہن میں۔ اس میں بڑی برکت ہے۔

چچا میاں: ہاں بھائی — بڑی برکت ہے۔ خدا نے چاہا تو چل نکلے گا۔

مجن میاں: میرے پڑوس میں ماتھر صاحب رہتے ہیں۔ اتفاق سے یہی کاروبار ہے ان کا۔ اپنا کارخانہ ہے۔ کم سے کم بیس تو کاری گر ہیں۔

چچا میاں: بیس عدد — یہ تو کچھ بھی نہ ہوئے۔ میاں میں تو آج ایک ایسا کارخانہ دیکھ کر آیا جہاں کم سے کم سو کاری گر رہے ہوں گے۔

مجن میاں: سو کاری گر؟

چچا میاں: ہاں! سو کاری گر! یقین مانو! بخدا!

مجن میاں: کمال ہے!

چچا میاں: تو سوچ رہا ہوں کہ یہ کام ٹھیک رہے گا۔ چل نکلا تو آصف کو۔

مجن میاں: (جلدی سے) امریکہ! ہاں صاحب! امریکہ کی کیا بات ہے!
چچامیاں: اصل میں محنت کی جائے تو ہر جگہ کامیابی ہے۔ پیسا۔ پیسے کو کھینچتا ہے۔ خدا کے فضل سے اتنا تو ہے ہی۔ سوچتا ہوں وہ آموں والا باغ جو گھر کے پاس ہے اسے بھی فروخت کرا آؤں۔
مجن میاں: بیچ دیجیے۔ کیا رکھا ہے اس میں؛
چچامیاں: خیر یہ تو نہ کہو۔ ایک سے ایک لاجواب پھل ہوتا ہے۔ تمھیں یاد ہے۔ کہاں کہاں سے قلمیں منگوائی تھیں؛ دربھنگہ، ملیح آباد، شاہ آباد، کلکتہ، پورا ملک چھان مارا تھا۔ ہر فصل میں کیا بہار آتی تھی۔
مجن میاں: وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر — اس سے یافت کیا ہوتی تھی۔
چچامیاں: یہ تو ہے۔ زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار۔ اصل میں ہماری طرف ریلوے اسٹیشن بن گیا ہوتا تو بات بنتی۔ بیل گاڑی پر آم ڈھونا حماقت ہے۔
مجن میاں: وقت بہت لگتا ہے صاحب! اور یہ زمانہ!
چچامیاں: اور نہیں تو کیا۔ میرے وہ ماموں زاد بھائی ہیں نا، سخاوت میاں۔ ان کا جے سنگھ پور والا باغ بس اڈے سے قریب تھا۔ خوب آمدورفت ہوتی تھی۔ پھل ہمارے باغ سے کچھ کم ہی ہوتے تھے۔ مگر یافت، ہم سے پانچ گنا۔ گھر بھر لیا۔ دو دو تو ٹریکٹر خرید لیے۔ چار چار ٹیوب ویل لگوا لیے۔ کوٹھی کھڑی کرلی۔ حد تو یہ ہے کہ موٹر بھی خرید لی۔ مگر اسی دکھاوے کے چکر میں خرچ بھی کیا بے حساب —
مجن میاں: تو آپ کب شروع کر رہے ہیں۔
(آصف چائے لے کر آتا ہے)
چچامیاں: لاؤ بیٹے! مجن میاں یہ لو۔ چائے پیو بھئی۔ اور آصف۔ بیٹے تم بھی بیٹھو! ذرا طے کرلیا جائے معاملہ۔ اچھا ہوا کہ مجن میاں بھی آگئے۔ ان کا دماغ خوب چلتا ہے ان باتوں میں۔
مجن میاں: (ہنس کر) مگر آپ سے کم بھائی صاحب۔ خدا کی قسم۔ جائے استاد خالی است۔
چچامیاں: بھائی کہاں کی استادی۔ کچھ چل نکلے کام تو بات بھی ہے۔ خیر — تو — (دور سے آتی ہوئی سائرن کی آواز۔ اچانک رکتے ہوئے)

چچا میاں : کیا وقت ہوا ہے۔ ذرا دیکھو تو گھڑی۔
آصف : نو بجے ہیں۔ نو بج کر پانچ منٹ۔
چچا میاں : ایں؛ نو بج کر پانچ منٹ! اور عارف میاں اب تک لاپتا ہیں۔
مجن میاں: کہاں گئے ہیں آخر؛
چچا میاں : نہ جانے۔ آصف! بیٹے ذرا کھڑکی سے جھانک کر دیکھو تو ــ چوراہے پر کہیں کھڑے تو نہیں ہیں۔
آصف : (کھڑکی کا پٹ کھولتا ہے۔ ٹریفک کا دبا دبا سا شور سنائی دیتا ہے) بھائی جان کہیں نظر نہیں آرہے ہیں؛
چچا میاں : کسی سڑک پر نہیں؛ دیکھو شاید کسی طرف سے آرہے ہوں۔
آصف : (ذرا رک کر) جی نہیں! جی نہیں! نہیں دکھائی دیتے۔
مجن میاں: کمال ہے؛ کہاں رہ گئے۔
چچا میاں : ہاں! عجیب بات ہے۔ کہاں تو ہر وقت کمرے میں گھسے رہتے تھے کہاں آدھی رات تک غائب۔
مجن میاں: نو بج کر دس منٹ ہونے کو ہیں۔
چچا میاں : آصف! ذرا اندر دیکھو۔ پوچھو تو۔
آصف : جی اچھا!

(باہر نکل جاتا ہے۔ وقفہ۔ واپس آتا ہے)

چچا میاں : کیوں کچھ پتا چلا؛
آصف : بھائی جان آگئے ــ اندر ہیں ــ
چچا میاں: کہاں ہیں؛ کیا کر رہے ہیں؛
آصف : نہا رہے ہیں ــ
چچا میاں : نہا رہے ہیں۔ اس وقت؛
آصف : جی! دیر سے نہا رہے ہیں ــ چچی امی کہتی ہیں بہت دیر سے نہا رہے ہیں۔
(حزینہ موسیقی کی ایک لہر۔ ابھرتی ہے، پھر بہت دھیرے دھیرے ڈوب جاتی ہے)
ڈراپ

△△

نیا ہنس نامہ

کردار :

۱۔ مرزا	عمر پچاس سال	جھکی، بجّی، جلد باز، بگڑے رئیس
۲۔ بیگم صاحبہ	عمر پینتالیس سال	چڑچڑی، قدامت پسند، ضدّی
۳۔ سہائے صاحب	عمر پچاس سال	مرزا صاحب کے پڑوسی، ہنسوڑ، فقرے باز
۴۔ بھاگونتی	عمر چالیس سال	سہائے صاحب کی بیگم، شرمیلی، کم سخن
۵۔ انور	عمر بارہ سال	مرزا کا بیٹا
۶۔ بدلو خاں	عمر ساٹھ سال	دُبلے پتلے، پھرتیلے، بھلکّڑ
۷۔ ڈاکٹر صاحب		

چند اجنبی کردار

ملبوسات :

مرزا	شیروانی، چوڑی دار پاجامہ، دو پلّی ٹوپی، پتلون، کوٹ، بو یا ٹائی، (لباس قصّے کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے)
بیگم	غرارہ، جمپر، دوپٹہ / نئی تراش کا سوٹ، گون۔
سہائے صاحب	کرتا، پاجامہ یا دھوتی، واسکٹ۔
بھاگونتی	ساڑی، بلاؤز۔
انور	کرتا، پاجامہ، ٹوپی / نیکر، بش شرٹ۔
بدلو	کرتا، تنگ پائنچے کا پاجامہ، رام پوری ٹوپی / وردی

ابتدائیہ:

مختلف لباسوں میں، چھے کردار، تھرکتے ہوئے، مزاحیہ موسیقی کی گت پر، دو دو کی ٹکڑیوں میں پردے پر آتے ہیں، گاتے ہیں، آگے چلے جاتے ہیں ـــ

پہلا جوڑا: (دو مرد، ایک بہت موٹا لمبا، دوسرا ٹھگنا)

کیا چوکور، کہاں کا گول
سب میں ہوتا ہے کچھ جھول
ہر نگری کا ایک ہی تول
کیا دلی کیا آسنسول

دوسرا جوڑا: (دو لڑکیاں، شوخ، چنچل)

رونا دھونا چھوڑو یار
دکھ کے بندھن توڑو یار

تیسرا جوڑا: (دو مرد، نیم دیہاتی لباس میں، ہاتھوں میں ڈفلیاں لیے)

سب کو یاد رہے یہ بول
سب کا جینا ہے انمول (ناچتے ہیں)
ناچے پھرکی باجے ڈھول
ہو جائے کچھ ہنسی ٹھٹھول

ڈزالو

CREDITS

تیسرا جوڑا گاتے گاتے جب رکتا ہے تو دو ڈفلیاں جو ان کے ہاتھوں میں تھیں، اچانک پورے اسکرین پر آجاتی ہیں۔ ان ڈفلیوں پر "نیا ہنس نامہ" لکھا ہوا ہے۔

پس منظر سے ڈھول کی تھاپ پر ایک ایک کر کے تمام CREDITS انھیں ڈفلیوں پر ابھرتے ہیں۔

CREDITS کے خاتمے پر بیک گراؤنڈ میوزک فیڈ آؤٹ ہوتی ہے۔

وقفہ

منظر ــــــــــ (ایک)

بازار ــــ دوپہر کا وقت مرزا ایک تانگے پر سوار چلے جا رہے ہیں۔ تانگے کی پچھلی سیٹ پر ان کے پاس ہی چھوٹے بڑے کئی پیکیٹ اور بنڈل رکھے ہوئے ہیں۔ مرزا نے یہ سارا سامان اس طرح چھاپ رکھا ہے جیسے انھیں ڈر ہو کہ کوئی لے اُڑے گا۔ ان کا تانگہ ایک پرانی گلی کے موڑ پر رکتا ہے۔ مرزا تانگے والے کو پیسے دیتے ہیں پھر سارا سامان خود سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈبے پھسل جاتے ہیں۔ آس پاس کھڑے ہوئے لوگ یہ تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ آخر تانگے والا مرزا کی مدد کرتا ہے اور کچھ پیکیٹ اُٹھا لیتا ہے۔ دونوں گھر کی طرف بڑھتے ہیں۔

مرزا : اما تانگے والے! ذرا تم ہی زنجیر کھٹکھٹاؤ! میرے تو دونوں ہاتھ پھنسے ہوئے ہیں۔

تانگے بان : نا بابا نا! مرجاجی! آپے کھٹکھٹاویں۔ ہمار و ہاتھ پھنسے ہیں۔

(مرزا غصّے سے تانگے بان کی طرف دیکھتے ہیں)

مرزا : اما عجیب آدمی ہو۔ لاؤ! وہ سامان مجھے دے دو۔ ہاں! ذرا سنبھال کے ــــ سنبھال کے۔

[سارے ڈبے پھسل جاتے ہیں]

مرزا : (چیختے ہوئے) اوں ہونہہ! اما بدلو خان! النور، امینہ ــ ارے بیں نے کہا سن رہی ہو! اُفوہ! سب کے سب بہرے ہیں۔ اما بدلو خان!

بدلوخاں : (دور سے) آریا اؤں، آریا ہوں مرزا صاحب!

دروازہ کھلتا ہے۔ بدلوخاں آکر سارے پیکیٹ اُٹھاتے ہیں۔ مرزا اور بدلوخاں، دونوں، اندر جاتے ہیں۔

ڈزالو

منظر ——————(دو)

مرزا کے گھر کا اندرونی برآمدہ۔ ایک طرف تخت بچھا ہے۔ سامنے کچھ مونڈھے۔ ایک گھڑونچی، فرش پر چند مرادآبادی لوٹے۔ اسٹول پر ایک کٹورا۔ حقہ۔ مرزا مُنہ ہی مُنہ میں بڑبڑاتے ہوئے شیروانی اتار کر تخت پر پھینکتے ہیں۔ سارا سامان جو وہ بازار سے لائے ہیں اسی تخت پر بے ترتیبی سے بکھرا ہوا ہے۔ مرزا کی بیگم آتی ہیں، بڑبڑاتی ہوئی اور پیر پٹکتی ہوئی۔

بیگم : (ایک چھلتی ہوئی نظر مرزا پر ڈالتی ہیں، پھر تخت پر) یہ سب کیا اُٹھا لائے۔ کاٹھ کباڑ!

مرزا : (ہانپتے ہوئے) سانس پھول گیا۔ کتنی دیر سے پکار رہا تھا۔ انور — امینہ — سب غائب — اور بدلوخان! تم تو سچ مچ جیسے کان میں تیل ڈالے پڑے تھے۔

بدلوخان : میاں آپ کی آواز سنتے ہی حقہ بھرنے جا رہا تھا۔

[مرزا حقارت آمیز نظروں سے حقے کی طرف دیکھتے ہیں]

مرزا : تمھارا مطلب ہے کہ حقہ! یعنی کہ حقہ! یہ حقہ! (حقے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔)

بدلوخان : ہاں میاں!

مرزا : اسے کباڑ کی کوٹھری میں ڈال دو! یا پھر ایسا کرو! حکیم اچھے صاحب کو دے آؤ! کہنا میری طرف سے یہ تحفہ ہے۔ بہت بار وہ اس حقے کی تعریف کر چکے ہیں۔ یا پھر، یا پھر۔

تم ہی لے لو۔

بیگم : (چڑکر) خبردار۔ مجال ہے کسی کی جو اسے لے جائے۔ یہ حقّہ ابا جانی کا ہے۔ پرانی یادگار!

مرزا : ابا جانی کی تو اور بھی بہت سی یادگاریں ہیں۔ وہ پرانا گراموفون جو بجتا ہی نہیں۔ نیواڑ کے پلنگ جو جھولے بن گئے ہیں۔ یہ نامعقول تخت ــــ معلوم ہوتا ہے۔ جہاز پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

بیگم : اور کہو! اور! رک کیوں گئے؟ میں بھی کون سی نئی نویلی ہوں۔ اور یہ بڈھے بھوس بدلو خان ــــ سب کو نکال دو گھر سے۔ دماغ چل گیا ہے تمھارا۔ سنک گئے ہو۔ بھلا بکواس کا مطلب کیا ہے؟

مرزا : سمجھنے کی کوشش کرو بیگم! زمانہ بدل گیا۔ تم لوگ نہیں بدلے۔ دنیا بدل گئی۔ تم سب لکیر کے فقیر ہو۔ اب میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔

بیگم : کیسا فیصلہ؟

مرزا : فرنیچر کا آرڈر دے آیا ہوں۔ اور بدلو خان! تمھارے لیے بھی نئی یونیفارم آگئی ہے۔ یونیفارم سمجھتے ہو؟ وردی! یعنی کہ وردی!

[جیب سے سگریٹ کا پیکیٹ نکالتے ہیں۔ پھر ایک ــــ سگریٹ سلگاتے ہیں۔]

بدلو خاں : کھی کھی کھی کھی کھی کھی (ہنستا ہے)

بیگم : یہ موا سگریٹ پی رہے ہو کہ چونچ دکھا رہے ہو۔

مرزا : یہ کیا بدتمیزی ہے۔

بیگم : (اچانک تن کر) کیا کہا؟ اپنے آپے میں رہو، میری بھی زبان کھل گئی تو! بکھان کر رکھ دوں گی!

مرزا : افوہ! بدلو خاں کو کہہ رہا تھا میں۔ تمھیں نہیں۔ بہ خدا۔
بدلو خان : (اچانک ایک آہٹ سن کر آنگن کی طرف دیکھتے ہوئے)
میاں بندر!
مرزا : (چیخ کر) کیا بکتے ہو؟ میں بندر ہوں!
[بدلو خان پھر کھی کھی کرنے لگتے ہیں]
مرزا : بند کرو یہ ہیہی کھیس نکال رکھی ہے! بند کرو۔ اما تمھاری عمر
کا خیال ہے، نہیں تو ـــ تمھاری یہ مجال۔ میں بندر ہوں!
بدلوخان : میاں آپ کو نہیں، اُسے کہہ رہا تھا۔
مرزا : کسے؟
بدلوخان : منڈیر پہ بندر تھا، سچ مچ کا بندر۔
بیگم : (سہم کر) ہائے اللہ!
بدلو خان : (گھبرا کر) بندر ـــ بندر ـــ بندر۔
مرزا : کہاں ہے بندر؟ کہاں ہے؟ بتاؤ ـــ! خو، خو، خو، خو۔خو!
[بیگم اور بدلو خاں کبھی منڈیر کی طرف دیکھتے ہیں کبھی
مرزا کی طرف۔ سارا منظر ڈزالو ہو جاتا ہے۔]

منظر ـــــــــ (تین)

سہائے صاحب کا دیوان خانہ۔ دیواروں پر فریم کی ہوئی چند
پرانی تصویریں۔ ایک چوکی دیوار سے لگی ہوئی۔ چند کرسیاں، کتابوں
کی ایک الماری۔ سہائے صاحب اور بھاگونتی چوکی پر بیٹھے باتیں
کر رہے ہیں۔

بھاگونتی : (رازدارانہ لہجے میں) میں تو کہتی ہوں کوئی چکر ہے۔
سہائے صاحب : کیسا چکر؟
بھاگونتی : ارے ہوگا کوئی ایسا ویسا۔ نہیں تو اس عمر میں یہ چونچلے۔ بھابھی
بیگم نے رو رو کر حالت بگاڑ لی ہے۔

سہائے صاحب: ہوا کیا؟ میں بھی تو سنوں۔

بھاگونتی: مرزا بھیّا ان کے لیے (شرما کر مُنہ پر ہاتھ رکھ لیتی ہیں)۔

سہائے صاحب: کیا؟ کیا ہوا؟

بھاگونتی: (ہنستی ہیں) مرزا بھیّا ان کے لیے ولایتی میموں جیسا گَون لائے ہیں۔

سہائے صاحب: تو اُس میں کون سی الجھنے کی بات ہے؟

بھاگونتی: ہے کیوں نہیں۔ بھابھی بیگم سے کہتے ہیں اسے پہنو!

سہائے صاحب: تو پہن لیں۔

بھاگونتی: ارے ایسے ہی پہن لیں؟ پرانی عادت اس طرح تھوڑی بدلتی ہے! اتنی جلدی تو موسم بھی نہیں بدلتا۔ مگر مرزا بھیّا۔

[دروازے پر دستک۔ باہر سے آواز آتی ہے۔]

مرزا: اما سہائے صاحب!

سہائے صاحب: (اُٹھتے ہوئے) آتا ہوں! آتا ہوں!

[جاتے ہیں۔ پھر سہائے صاحب اور مرزا آتے ہیں۔
چاپ سنتے ہی بھاگونتی سر پر پلّو درست کرتی ہیں۔]

مرزا: آداب بھاگونتی بھابھی۔ آداب۔

[بھاگونتی حیرت سے مرزا کی طرف دیکھتی ہیں۔ مرزا نے تھری پیس سوٹ پہن رکھا ہے، مُنہ میں سگریٹ]

سہائے صاحب: ذرا دیکھو مرزا کو۔ واہ۔ عین بین سرکس کے جوکر۔ باسی کڑھی میں اتنا اُبال؟ (ہنستے ہیں)۔

[مرزا گلا صاف کرتے ہیں۔ بھاگونتی ہنسی ضبط کرتی ہوئی اُٹھ کر اندر چلی جاتی ہے۔]

مرزا: (گڑبڑا کر) ارے رے رے۔ میں تو شام کے کھانے پر بلانے کے لیے آیا تھا۔ بھابی جی! بھابی جی! ارے — وہ تو اندر چلی گئیں۔

(دونوں کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔)

سہائے صاحب: آجائیں گی! آجائیں گی۔ لیکن یہ تو بتاؤ اس دعوت کا سلسلہ کیا ہے؟

مرزا: (فخریہ) میری برتھ ڈیٹ!

سہائے صاحب: اچھا اچھا — برتھ ڈے۔ تمھارا مطلب ہے سالگرہ۔

مرزا: اما ہاں ہاں۔ وہی تو کہہ رہا ہوں۔ تم انگلش ذرا دیر میں سمجھتے ہو۔ آج شام ہمارے ساتھ لنچ کھاؤ!

سہائے صاحب: شام —؟ لنچ؟

مرزا: ہاں! لنچ! (دوسرا سگریٹ سلگاتے ہیں۔)

(بھاگونتی چائے کی ٹرے لیے اندر آتی ہیں۔
سہائے صاحب زیر لب مسکراتے ہیں)

سہائے صاحب: ارے بھائی، یہ مرزا آج پیدا ہوئے ہیں۔ سالگرہ منا رہے ہیں۔

(بھاگونتی ہنستی ہیں)

مرزا: آپ دونوں آج شام لنچ۔

سہائے صاحب: (ٹوکتے ہوئے) ڈنر!

مرزا: (چڑھ کر) اما تم دعون صاحب سے زیادہ انگلش تو نہیں جانتے۔ انھوں نے پچھلے اتوار کو جو دعوت کی تھی، کارڈ پر لنچ ہی لکھا تھا۔

سہائے صاحب: وہ دعوت دن میں ہوئی تھی۔ رات میں ڈنر ہوتا ہے۔ سمجھے؟

(مرزا سوچ میں پڑ جاتے ہیں)

مرزا: (اچانک پہلو بدلتے ہوئے) اما سہائے صاحب! یہ بھابی نے چائے بلا وجہ بنوائی۔ میں ذرا جلدی میں تھا۔ شام کی دعوت کا بہت سا ایڈمنسٹریشن کرنا ہے۔

سہائے صاحب: (زیرِلب مسکراتے ہوئے) اب چائے آگئی ہے تو پی لو!
(بھاگونتی دونوں کو پیالیاں دیتی ہیں۔)

مرزا : (چسکی لے کر) اما کیا عمدہ ٹی (TEA) ہے۔ بہت عمدہ فلاور (FLOWER) ہے۔ ہے نا! تمھیں میری قسم! سچ کہنا۔

سہائے صاحب: (ہنستے ہوئے) ہاں! ٹھیک ہے!

مرزا : (بھاگونتی کو مخاطب کرتے ہوئے) دیکھا بھابی! بس کہ دیا ٹھیک ہے۔ یعنی کہ کوریکٹ (CORRECT) ہے۔ اما سہائے صاحب! بھابی صاحب کی تعریف میں بہت کنجوس ہو تم!

سہائے صاحب: مرزا! ایک بات پوچھوں!

مرزا : پوچھو!

سہائے صاحب: ہماری بھابی بیگم کو تمھاری یہ کایا پلٹ کیسی لگی؟

مرزا : اما کیا پوچھتے ہو؟ کیا بتاؤں۔ اُنھیں کیا پتا دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ وہی چکن (CHICKEN) کی ایک ٹانگ۔

سہائے صاحب: کیا مطلب؟

مرزا : مطلب کیا۔ بھائی بات یہ ہے کہ انگلش پڑھے بغیر آدمی کچھ نہیں بنتا۔ انگریزوں کا جواب نہیں۔ میں تو ہمیشہ سے انگریزوں کو پسند کرتا ہوں۔ رہنا سہنا تو کوئی ان سے سیکھے۔

سہائے صاحب: پھر تمھیں اتنے دنوں بعد یہ سمجھ کیوں آئی؟

مرزا : کیا کہوں؟ بس یہ سمجھ لو کہ مجبور تھا۔ لیکن انور اور رابعہ کو میں نے پرانی لیک پر نہیں چلنے دیا۔ دونوں فراٹے سے انگلش بولتے ہیں۔ اما انگریز چلے گئے تو کیا ہوا، انگلش تو ہے۔ پھر ان کا کھانا پینا، اُٹھنا بیٹھنا، پہننا اوڑھنا کیا بات ہے۔

بھاگونتی : یہ بسکٹ نہیں لیا آپ نے مرزا بھیا۔

مرزا : بسکٹ؟ برطانیہ والا ہے۔ برطانیہ؟ اپنے ملک میں سچ

پوچھو تو بسکٹ بنانا آتا ہی نہیں لوگوں کو۔ خیر۔ آپ کہتی ہیں۔
تو یہ لیتا ہوں۔

[چائے میں ڈبو ڈبو کر بسکٹ کھاتے ہیں۔
سہائے صاحب مسکرا کر بھاگونتی کی طرف دیکھتے ہیں۔]

مرزا: (اُٹھتے ہوئے) اچھا اب چلتا ہوں! تو تم دونوں کو آنا ہے۔
سمجھے۔ میں نے بس تمہی کو بلایا ہے۔ سمجھو گھریلو فنکشن ہے۔
(مرزا رخصت ہوتے ہیں۔ گلی میں کیمرہ مرزا کا تعاقب
کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ غائب ہو جاتے ہیں۔
پس منظر سے مزاحیہ موسیقی۔)

منظر ---------- (چار)

مرزا کے گھر کا برآمدہ۔ پورا نقشا بدل چکا ہے۔ تخت کی
جگہ صوفہ سیٹ۔ کھانے کی میز۔ کرسیاں۔ بدلو خاں بیروں کی
وردی پہنے بیزاری کے عالم میں میز صاف کر رہے ہیں۔ اچانک
باہر سے زنجیر کھٹکھٹانے کی آواز۔ مرزا اپنی فیلٹ کیپ درست
کرتے ہوئے سامنے آتے ہیں ——

مرزا: بوائے! بوائے — امابدلو خاں!

[بدلو خاں دوڑے ہوئے سامنے آتے ہیں۔]

مرزا: بہرے ہو گئے ہو؟ سن نہیں رہے ہو؟

[زنجیر کی آواز]

بدلو خاں: میاں سن تو ریا تھا۔ پاس ہی تو کھڑا تھا۔ میں سمجھا کسی
کو بلا رئے ہیں۔

مرزا: یہ میاں ویاں اب نہیں چلے گا۔ سمجھے۔ سَر کہا کرو! سمجھے!

[بدلو خاں سر پر اپنی ٹوپی درست کرتے ہیں۔]

مرزا: میں باہری دروازے کی طرف جاتا ہوں۔ سہائے صاحب

آ گئے شاید تم جلدی جلدی صفائی کرو۔ اور ہاں سب لوگ آ کر بیٹھ جائیں۔ تو سب سے پہلے سوپ لانا۔ میرا مطلب ہے کھانا شروع ہونے سے پہلے۔

بدلو خاں: (گردن ہلا کر) ٹھیک ہے!

مرزا: اور بیگم صاحب کو بلاؤ۔ انور اور امینہ کو بھی بلاؤ۔

[جاتے ہیں]

[بدلو خاں صفائی میں لگے رہتے ہیں۔ سہائے صاحب، بھاگونتی اور مرزا اندر آتے ہیں اور بیٹھ جاتے ہیں۔]

سہائے صاحب: (حیرت سے) ارے! میں تو پہچانا ہی نہیں یہ بدلو خاں ہیں! تم بھی بدل گئے۔

[بدلو خاں خفّت آمیز انداز میں کبھی کھی کھی کرتے ہیں]

مرزا: بیگم صاحب! انور— امینہ— کہاں ہیں۔ اُن سے کہو کہ گیسٹ لوگ آ گئے۔ سب یاد کرنا مانگتا۔

بدلو خاں: (حیرت سے مرزا کی طرف دیکھتے ہیں) یس سر!

[سہائے صاحب کا قہقہہ۔ بھاگونتی حیران آنکھ سے تماشہ دیکھ رہی ہیں۔]

[ایک ایک کر کے سب آتے ہیں اور بیٹھ جاتے ہیں]

مرزا: (پکارتے ہوئے) بولئے! اما بدلو خاں! ڈنر لگ گیا—

[بدلو خاں بھاگے ہوئے آتے ہیں۔]

بدلو خاں: لگ گیا سر!

[مرزا معنی خیز انداز میں ان کی طرف دیکھتے ہوئے اشارہ کرتے ہیں۔]

[بدلو خاں جاتے ہیں۔ پھر واپس آتے ہیں۔ ہاتھ میں سوپ دبا ہوا ہے۔]

مرزا: یہ۔ یہ۔ کک۔ کیا ہے—؟

بدلو خاں : سوپ سر! (سہائے صاحب، انور، امینہ کا قہقہہ)
مرزا : گنوار کہیں کے۔ یہ سوپ ہے!
بیگم : ہے ہے۔ تو صاف کیوں نہیں کہتے کہ وہ حقّے والا پانی لائیں۔
سہائے صاحب : حقّے والا پانی؟
بیگم : ہاں! موئے کا مزا ویسا ہی ہوتا ہے۔ مجھے تو دیکھ کر متلی ہوتی ہے۔ ہفتے بھر سے روز پیتے ہیں۔ یہ نئی لت لگالی ہے۔
مرزا : بیب ۔ بیگم ۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ تم لوگوں کو کبھی جینا نہیں آئے گا۔
بیگم : (مڑکر) تو ہیں گنوار ہوں۔ اجڈ ہوں۔ خوش ہوں۔
مرزا : اور نہیں تو کیا میں ہوں؟
بیگم : (روہانسی ہوکر) شرم نہیں آتی تمھیں۔ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ کہاں، کس کے سامنے، کیا کہہ رہے ہو؟
انور : (کھڑے ہوکر) آرڈر۔ آرڈر۔ (میز تھپتھپاتا ہے)
انور : ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا اگر مزاج گرم رہا تو۔ مزاج کو ٹھنڈا کیجیے۔ گرم کھانا کھائیے۔
مرزا : (چیخ کر) سوپ!

[بدلو خاں جلدی سے اندر جاتے ہیں اور ٹرے میں سوپ کی پیالیاں لے کر آتے ہیں۔]

مرزا : (ایک ہی سانس میں چڑھا جاتے ہیں) اینڈ! (AND) (بدلو خاں کی طرف دیکھ کر) اینڈ لاؤ بوائے۔

[بدلو خاں حیرت سے دیکھتے ہیں۔]

امینہ : ابّی کا مطلب ہے اور لاؤ ان کے لیے۔
بیگم : میری پیالی دے دو! میں نہیں پیتی یہ حقّے کا پانی۔
مرزا : (ہاتھ بڑھا کر دوسری پیالی اُٹھاتے ہیں) کوئی بات نہیں وقت لگے گا۔ وقت لگے گا۔ ٹائم۔ یعنی کہ بہت وقت لگے گا سدھرتے

میں ـــــ

بیگم : (چڑ کر) مجھے سوانگ بھرنے تو آتے نہیں کہ آن کی آن میں اپنا حلیہ بدلتی رہوں۔

انور : آرڈر! آرڈر! (میز تھپتھپاتا ہے) اب آپ لوگ کھانے کے لیے اُٹھیں۔

[سب اُٹھتے ہیں۔ ہاتھ دھوکر میز کے گرد بیٹھ جاتے ہیں۔ بھاگونتی اور بیگم میں کچھ سرگوشی ہوتی ہے۔]

بیگم : (مرزا کو مخاطب کر کے) ارے کم سے کم ہاتھ تو دھو لیے ہوتے!

مرزا : تو کیا میں گنواروں کی طرح ہاتھ سے کھاؤں گا۔ اما سہائے صاحب! بھاگونتی بھابی ـــ میز پر دیکھو۔ اتنے بہت سے چھری کانٹے یعنی کہ تھارن (THORN) رکھے ہوئے ہیں۔

امینہ : اجی! خدا کے لیے۔

مرزا : کیا ہے؟

امینہ : ہاتھ سے کھانا کھائیے۔

مرزا : کبھی نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ (فیصلہ کن انداز میں) میں عہد جاہلیت سے نکل آیا ہوں! ہمیشہ کے لیے۔

انور : مگر ہم لوگ تو ـــــ

مرزا : (مُنہ بنا کر) تم لوگ اگر ضد پر اڑے ہوئے ہو تو اڑے رہو۔۔ صاحب! کیا بات ہوتی تھی انگریزوں کی بھی۔ بہت صفائی پسند ہوتے تھے۔ اما مجال ہے کہ کھانے کی چیز میں ہاتھ لگ جائے۔

[کھانا شروع ہوتا ہے۔ مرزا پلیٹ میں سلاد نکالتے ہیں۔ چھری کانٹے سے ککڑی کا ایک ٹکڑا کھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ٹکڑا اچھل کر اوپر جاتا ہے، پھر نیچے گر پڑتا ہے ـــ]

سہائے صاحب : اما مرزا میری بات مانو تو یہ ایکسر سائز (EXERCISE) چھوڑو!

بھلے آدمیوں کی طرح کھانا کھاؤ!

بیگم : (دانت پیس کر مرزا کی طرف دیکھتی ہیں) کاہے کو اپنی ہنسی اڑوانے پر تلے ہوئے ہو؟

[مرزا کانٹے میں گوشت کا ٹکڑا پھنساتے ہیں۔ ہونٹ تک لے جاتے ہیں۔ اچانک ٹکڑا اگر پڑتا ہے اور خالی کانٹا ہونٹ سے ٹکراتا ہے۔ سب ہنسی روکے کھانے میں مصروف رہتے ہیں۔ مرزا اب کانٹے سے کچھ اور کھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اچانک کانٹا ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ مرزا کی سسکی۔]

امینہ : کیا ہوا؟ ابی کیا ہوا؟

مرزا : (بے چینی سے) اوہ۔ اوہ۔ اوہ۔

انور : کیا ہوا ابی!

مرزا : وہ کک۔ کانٹا حلق میں چبھ گیا۔ کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔

[مرزا پھر کوشش کرتے ہیں۔ اس بار سالن چمچے سے اُٹھاتے ہیں۔ ہاتھ ٹیڑھا ہوتا ہے اور پورے منہ پر پچکاری سی پھیل جاتی ہے۔]

مرزا : (گھبرا کر) لوائے! لوائے۔

[بدلو خاں بڑی مشکل سے ہنسی روکتے ہیں۔]

بدلو خاں : ہاں میاں!

مرزا : (دانت پیس کر) سر کھو۔ سر! سمجھے۔ اور وہ لاؤ۔ وہ۔ کیا کہتے ہیں۔

سہائے صاحب : آئینہ!

(سب ہنستے ہیں)

مرزا : (منہ بنا کر) اما ہٹو بھی۔ میں کہتا ہوں وہ لاؤ۔ وہ نیپکن! نیپکن!

[اچانک کراہتے ہوئے اُٹھتے ہیں اور برآمدے کے در میں کھڑے ہو کر کلی کرتے ہیں۔]

امینہ : (گھبراکر) خون ۔خون !

بیگم : ہائے اللہ ۔ کیا ہوا۔

مرزا : کچھ نہیں۔ کہیں کچھ نہیں۔ بس ذرا اخروٹ چھل گیا ہے۔

بیگم : حکیم صاحب کو بلاؤ بدلو خاں ! جلدی جاؤ ! حکیم صاحب !

[مرزا کلی کرنے میں مصروف ہیں۔]

ڈزالو

منظر ------------ (پانچ)

وہی برآمدہ پرانا نقشا۔ تخت، گاؤ تکیے۔ مونڈھے، بان کا پلنگ، مرزا تخت پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔ چہرے پر جگہ جگہ روئی کے پھائے لگے ہوئے ہیں۔ پرانے حلیے میں مرزا کا کلوزاپ کیمرہ دھیرے دھیرے زوم آؤٹ کرتا ہے۔ بدلو خاں پانی کا کٹورا لیے اپنے پرانے حلیے میں کھڑے ہیں۔ حکیم صاحب مرزا کی نبض دیکھ رہے ہیں۔ انور بھی پاس ہی موجود ہے۔

حکیم صاحب : میں ایک لیپ بھجوائے دیتا ہوں۔ سارے زخم دھو کر لگا لیجیے گا۔

مرزا : (کراہتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ کر) اور خمیرہ بھی۔

حکیم صاحب : ہاں خمیرہ بھی ۔ دل کمزور ہو گیا ہے۔

مرزا : (انور سے) بیٹے۔ وہ نامعقول چھری اور کانٹے پھینکوا دو۔ اور وہ میز اور صوفہ ۔ سب تم اپنے کمرے میں لے گئے نا !

انور : جی ابّی !

مرزا : بدلو خاں۔

بدلو خاں : ہاں میاں!

مرزا : میرا کھانا سینی میں لگا کر تخت پر ہی لے آؤ ! دو روز سے بھوکا ہوں۔

حکیم صاحب : (حیرت سے) بھوکے ہیں۔ ؟ کیوں ؟

مرزا : حکیم صاحب ! بس ایک آلو کا قتلہ حلق تک پہنچا تھا۔ باقی ۔ باقی

سب پلیٹ سے اُٹھا اور پلیٹ میں آگرا۔

[بیرونی دروازے پر دستک]

سہائے صاحب: (دور سے) ارے میں آسکتا ہوں!

مرزا: بدلو خاں! جاؤ! سہائے صاحب کو لے آؤ۔

[بدلو خاں جاتے ہیں۔ سہائے صاحب کے ساتھ واپس آتے ہیں۔ اس دوران مرزا دھیرے دھیرے کراہتے ہیں۔]

سہائے صاحب: (حیرت سے) ارے مرزا! یہ کیا؟ تم تو لگتا ہے فرنٹ پر لڑائی لڑکے آئے ہو۔ زخمی سپاہی کی طرح۔

مرزا: (دھیرے سے) ہاں بھائی۔ اپنے آپ سے لڑ رہا تھا۔ خود کو زخمی کر ڈالا۔

حکیم صاحب: بدلو خاں! آؤ میرے ساتھ آؤ۔ دوائیاں لیتے آؤ۔ چلو۔

[حکیم صاحب اور بدلو خاں جاتے ہیں۔ بیگم اندر آتی ہیں۔]

بیگم: گئے حکیم صاحب!

مرزا: (گلوگیر ہو کر) ہاں گئے! بیگم! مجھے معاف کر دو! تم ٹھیک کہتی تھیں۔ وہ سوپ — نامعقول سوپ پینے میں زبان جل گئی — حلق چھل گیا۔ ہونٹ زخمی ہو گئے۔

سہائے صاحب: اما مرزا — اب سچ مچ تم اوریجنل دکھائی دیتے ہو۔

[مرزا کا کلوز اپ]

[مرزا کے ہونٹ پھڑپھڑا رہے ہیں۔ بیگم ہمدردانہ نظروں سے ان کی طرف دیکھتی ہیں۔ مرزا کے چہرے پر خفت کے آثار — سارا منظر دھیرے دھیرے فریز ہو جاتا ہے۔]

[پس منظر سے اختتامیہ موسیقی]

(ماخوذ) △△

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے

آوازیں:

۱. راشد صاحب	عمر تقریباً چالیس برس
۲. سلطانہ	راشد صاحب کی بیگم
۳. ورماجی	راشد صاحب کے دوست
۴. پرگتی	ورماجی کی بیوی
۵. چچامیاں	راشد صاحب کے چچا
۶. راجو	ملازم

مضحکہ خیز موسیقی کی ایک لہر

فیڈ آؤٹ

[اُسی لہر سے ہم آہنگ قدموں کی چاپ۔ دروازہ تھپتھپانے کی آواز ــــــ]

سلطانہ : (باہر سے) ابھی تک آپ اُلجھے ہوئے ہیں؟ اُسی چکر میں۔

راشد صاحب : (چونک کر) کون؟ سلطانہ؟

[ہڑبڑا کر کرسی سے اُٹھتے ہیں۔ دروازہ کھلتا ہے۔ سلطانہ اندر آتی ہے۔]

سلطانہ : ذرا دیکھوں تو آپ کا کارنامہ! کوئی گھنٹے بھر سے آپ سر کھپا رہے ہیں! بھلا کوئی نتیجہ بھی نکلا اس محنت کا؟

راشد صاحب : بس بس بس۔ ایک دس منٹ کی مہلت اور دو۔ یہ معمولی مسئلہ نہیں ہے۔ اچھے اچھوں کے ہوش ٹھکانے لگ جاتے ہیں۔ پچھلے ہفتے بھر سے دیکھ رہا ہوں۔ دفتر میں سب کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ جسے دیکھو منہ اٹھائے میرے پاس چلا آرہا ہے۔ راشد صاحب، راشد صاحب کی رٹ لگی ہوئی ہے۔

سلطانہ : کیوں؟ کیا سب کے گھر کا بوجھ آپ ہی نے سنبھال رکھا ہے؟

راشد صاحب : افوہ! تم نہیں سمجھوگی۔ یہ بجٹ کے معاملات ہیں۔ جمع خرچ دونوں کا برابر حساب رکھنا پڑتا ہے۔ لوگ جانتے ہیں کہ میں اس میدان میں EXPERT ہوں۔ جمع

خرچ۔

سلطانہ: جمع خرچ؟

راشد صاحب: ہاں ہاں جمع خرچ ـــ زندگی کا اصل مسئلہ ہی جمع خرچ کا مسئلہ ہے!

سلطانہ: مگر آپ تو کہہ رہے تھے کہ اس مہینے میں جمع کے نام پر کل پچہتر روپے ہاتھ آئے ہیں۔

راشد صاحب: ہاں ہاں، پچہتر روپے ـــ ورما کو تو صرف اڑسٹھ ملے۔ اس حساب سے دیکھا جائے تو ہم عیش کر رہے ہیں۔ خیر! انکم ٹیکس نے سب کا صفایا کر دیا۔

سلطانہ: پھر؟

راشد صاحب: پھر کیا؟

سلطانہ: ارے میں کہتی ہوں جمع کا حساب تو سامنے ہے۔ خرچ کا کیا سوچا آپ نے؟

راشد صاحب: (اطمینان بھرے لہجے میں) دیکھو بیگم، دس منٹ میں یہ قصہ نپٹ جائے گا۔ میں نے اچھی طرح سوچ لیا ہے۔ دس منٹ بعد سارا لیکھا جوکھا تمھارے سامنے رکھ دوں گا۔ تم گھبراتی کیوں ہو؟

سلطانہ: بجلی اور ٹیلی فون کے بل آئے پڑے ہیں۔ گرجا شنکر کی دکان سے سامان آچکا ہے۔ راجو کی تنخواہ، پھر اخبار والا ـــ اور ہاں، آج سے ٹھیک پانچ روز بعد ریکھا کی شادی ہے۔ اس نے ہماری شادی پر سلک کی ساری دی تھی۔ ہمیں بھی سلک کی ساری دینی ہوگی۔ پانچ سو سے کم میں کیا آئے گی۔ چچا میاں کا حقّے کا تمباکو ـــ پھر دودھ والا، سبزی والا، گوشت والا، اور ہاں ـــ تمھاری دوا ختم ہوگئی ہے۔ اس کے لیے۔

راشد صاحب: (بات کاٹ کر) بس بس بس۔ ارے بھئی میں نے سب کچھ اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ سات سو کی بچت کا حساب بنا چکا ہوں۔ ابھی دیکھنا ـــ بس دس منٹ بعد۔ جب تک تم ایسا کرو، ایک پیالی چائے۔

سلطانہ: چائے؟

راشد صاحب: نن نہیں، چائے سے ACIDITY بڑھتی ہے۔ نہیں پیتے چائے۔ دیکھو، لگے ہاتھوں ایک روپیا اور بچ گیا۔ اگر اس مہینے میں ہم دونوں مل کر پچاس پیالیاں چائے کی نہ پئیں تو سمجھ لو کہ پچاس کی بچت۔

سلطانہ: (حیرانی سے) آپ، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟

[مضحکہ خیز موسیقی کی لہر]

فیڈ ان:

حقّے کی مسلسل گڑگڑاہٹ۔ کھانسی کی آوازیں۔

چچا میاں: (ہانپتے ہوئے) راجو۔ ارے او راجو۔

[بھاگتا ہوا آتا ہے]

راجو: جی میاں:

چچا میاں: (منہ بنا کر) جی میاں ــ ارے میں کہتا ہوں کان میں سرسوں کا تیل ڈال رکھا تھا کیا؟

راجو: تیل ختم ہو گیا ہے۔

چچا میاں: کیا کہا؟ تیل ختم ہو گیا؟ کیا مطلب؟

راجو: مطلب یہ کہ سرسوں کا تیل ختم۔ صاحب کہتے ہیں کھانا ابال کر پکاؤ۔ اس سے تندرستی ٹھیک رہتی ہے۔ آدمی موٹا نہیں ہوتا۔

چچا میاں: تو کیا آج سبزی ترکاری بس ابال دی گئی ہے؟

راجو: جی میاں!

چچا میاں: (غصے سے) ہونہہ۔

[لگاتار حقے کے کش لیتے ہیں]

[دور سے کال بیل کے بجنے کی آواز]

چچا میاں: اوں ہوں، تو نے سچ مچ کان میں تیل ڈال رکھا ہے۔ ذرا دیکھ تو کون آپہنچا۔ چھٹی کے دن بھی لوگ باز نہیں آتے۔ ذرا لپک کر دیکھ تو کون منحوس ہے۔

ورما جی: (دور سے) یہ میں ہوں چاچا جی، ورما۔

چچا میاں: (ڈپٹ کر راجو سے) نالائق، تو ابھی تک ڈٹا ہوا ہے؟

ورما جی: (دور سے) ارے چاچا جی، آپ کہیں تو ہم چلے جائیں۔

چچا میاں: (چیخ کر) ارے میاں تمھیں نہیں اس گدھے کو کہہ رہا ہوں۔ جا کر انھیں اندر لے آ۔

[راجو جاتا ہے۔ دروازہ کھلتا ہے۔ ورما جی اور پرگتی اندر آتے ہیں۔]

ورما جی: نمستے چاچا جی!

پرگتی : نمستے جی!

چچاصاحب: جیتے رہو، جیتے رہو۔ بیٹھو، بیٹھو ـــ اچھا ہوا تم لوگ آ گئے۔ مجھے تو وحشت ہو رہی تھی۔ راشد اور سلطانہ پتا نہیں کہاں نکل گئے، صبح صبح۔ کچھ بتایا بھی نہیں ـــ بس یہ کہہ گئے کہ دوپہر کے بعد آئیں گے۔

پرگتی : (گھبرا کر) دوپہر کے بعد؟ تو کیا کھانا۔

راجو : صاحب اور بیگم صاحب دونوں کھانا باہر کھائیں گے۔

ورماجی: ارے، ہم نے تو سوچا تھا۔

چچامیاں: کہو کہو، کہتے کیوں نہیں میاں۔ کیا کیا سوچا تھا بھلا تم نے!

پرگتی : سوچا تھا آج سلطانہ بھابی کے ہاتھ کا کھانا کھائیں گے۔

چچامیاں : ارے بی بی ـــ سلطانہ بیگم ہوتیں بھی تو کون سا اُن کے ہاتھ کا پکا تمھیں مل جاتا۔ یہ لونڈا راجو، کچا پکا جو پکا کر رکھ دے، اُسی پر شکر ادا کرتے ہیں۔

ورماجی : کوئی بات نہیں چاچاجی، پھر کبھی سہی۔

چچامیاں : پھر کبھی کیوں؟ کیا میں یہاں موجود نہیں ہوں؟ کیا میرے لیے کھانا نہیں پکے گا۔ جو میں کھاؤں گا، وہی تم دونوں کے لیے حاضر ہے۔ ہی ہی ہی ہی۔

پرگتی : ہی ہی ہی ہی ہی۔

ورماجی : (کھسیاہٹ کے انداز میں) ہی ہی ہی ہی ہی۔

(وقفہ۔ راجو کے ہونٹ پھیل جاتے ہیں)

چچامیاں : یہ تیری بتیسی کیوں نکل آئی۔ ناہنجار کہیں کا!

[راجو ہنسی روکنے کی کوشش میں کھانسنے لگتا ہے اور باہر نکل جاتا ہے]

چچامیاں : دیکھا بی بی ـــ اس لونڈے راجو کو ـــ راشد میاں اور سلطانہ بیگم نے اسے سر چڑھا رکھا ہے۔ میں نے ہزار بار کہا۔ نوکروں کو مُنہ لگانا اچھی بات نہیں۔ مگر ـــ وہ بھی کیا کریں؟ سلطانہ بیگم کو روٹی بیلنی تو آتی نہیں۔ اس گھر کا پورا کارخانہ راجو کے دم قدم سے چل رہا ہے۔ پرگتی بیٹی! یہ آج کل کی لڑکیاں نہ کھانا پکانا جانیں نہ سینا پرونا ـــ ایک سے ایک نکھٹّو!

پرگتی : جی چاچاجی!

بچامیاں : اور نہیں تو کیا ۔ ایک زمانہ تھا جب باورچی خانے کی ساری رونق گھر کی عورتوں کے دم سے ہوتی تھی۔ خان ساماں کے ہاتھ کا کھانا ہمارے آبا حضور نے کبھی چکھا ہی نہیں ہمیشہ ہماری والدہ محترمہ ــــ کباب، کوفتے، پلاؤ۔ مچھلی تلی ہوئی۔

درماجی : کباب، کوفتے، پلاؤ ــــ مچھلی تلی ہوئی۔۔۔

بچامیاں : قورمہ۔

درماجی : کورمہ۔

بچامیاں : شاہی ٹکرے۔ ورقی پراٹھے۔

درماجی : (دھیرے سے) شاہی ٹکڑے۔ ورکی پراٹھے۔

پرگتی : ایسا لگتا ہے، چاچاجی، آپ کو بھوک لگی ہے۔

بچامیاں : ہاں بیٹی پرگتی۔ اس وقت اچانک بھوک چمک اُٹھی۔ راجو، او راجو۔

پرگتی : تو میں راجو کی مدد کرتی ہوں۔ (اٹھتے ہوئے) کیا کھائیں گے آپ؟

بچامیاں : مُنہ کا مزا بدلنے کے لیے ــ کیوں نہ پوری، ترکاری۔

درماجی : پوری، ترکاری ــــ اور؟

بچامیاں : اور اچار۔

درماجی : اور اچار ــــ اور؟

چچاں میاں : اور کھیر ــ بس کھیر۔

درماجی : کھیر، کھیر ــــ ہاں بس کھیر۔

پرگتی : (ہنس کر) اس وقت آپ دونوں بہت بھوکے ہیں۔ ہیں نا چاچاجی!

بچامیاں : بھبھ بھوک ــــ ہاں ہاں ــــ اصل میں آج ناشتہ بھی ہلکا رہا۔ روز صبح دو انڈوں کا خاگینہ کھانے کی عادت تھی۔

درماجی : دو انڈے۔

بچامیاں : ہاں، اور بس دو چھوٹی چھوٹی روغنی ٹکیاں ــــ یا پراٹھے۔

درماجی : ٹکیاں ــــ پراٹھے۔

بچامیاں : اور ایک پیالہ دودھ کا

درماجی : ایک پیالہ دودھ۔

چچامیاں: اور کوئی ایک موسمی پھل ـــ سیب، پپیتا یا دو کیلے۔
ورماجی: پھل ـــ سیب، پپیتا، دو کیلے۔
[پرگتی کا قہقہہ]
پرگتی: آپ دونوں سچ مچ بھوک سے بے حال ہیں۔ دیکھیے گا، میں جھٹ پٹ کھانا بنواتی ہوں۔
[باورچی خانے کی طرف جاتی ہے۔ دور سے برتنوں کی کھٹ پٹ]
چچامیاں: میاں، اب کوئی کیا کھائے گا۔ خاک! تمہاری عمر کا تھا تو ناشتے میں ایک پورا مرغ چٹ کر جاتا تھا یا پھر کم سے کم پانچ چھے شاہی کباب اور روغنی ٹکیاں ـــ یا تافتان، کلچے، باقرخانی کے ساتھ بالائی ـــ مغزیات اور میوہ جات کی بنی ہوئی تُرتی ـــ ترتراتا ہوا خالص دیسی گھی کا بنا ہوا گرم گرم حلوہ ـــ مگر اب۔
ورماجی: جی چاچاجی ـــ اب یہ ٹھاٹ کہاں!
چچامیاں: چیزوں کی قیمت آسمان سے باتیں کرنے لگی۔ جو حال اس ملک کے بجٹ کا ہے وہی گھر کے بجٹ کا۔ کوئی کیا کھائے کیا بچائے۔ ہونہہ ـــ دونوں پر بس نہیں چلتا۔
[پس منظر سے برتنوں کی کھٹ پٹ]
چچامیاں: میرا خیال ہے پرگتی بیٹی آج کچھ زیادہ ہی اہتمام کر رہی ہے۔ (ہنستے ہیں)
ورماجی: اُسے کھانا بنانے کا شوق بھی بہت ہے۔
چچامیاں: ارے بھئی ـــ بھلے لوگوں کو یہی تو ایک شوق رہ گیا ہے۔ اچھا کھانا، آٹھ پہر شکرانہ۔
ورماجی: پرگتی بھنڈی کی کلونجی بہت بڑھیا بناتی ہے۔
چچامیاں: خوب۔
ورماجی: اور بینگن کا بھرتہ ـــ اور پالک پنیر۔
چچامیاں: (اندر ہی اندر خوشی کو دباتے ہوئے) اور ـــ اور؟
ورماجی: آلو کی کھیر۔
(وقفہ)
ورماجی: دہی بڑے۔
(وقفہ)
ورماجی: کابلی چنے کے چھولے۔

(وقفہ)

ورماجی: اور راجما — لاجواب بناتی ہیں۔

چچامیاں: (اونچی آواز سے پکارتے ہوئے) ارے بیٹی پرگتی — لگتا ہے تم ہماری دعوت کا اہتمام کر رہی ہو۔ راجو — ابے را راجو۔

راجو: (دور سے) آیا صاحب۔

[آتا ہے]

چچامیاں: ایسا کریو کہ ذرا ہرے دھنیے کی چٹنی بھی پیس لیجیو۔ اور ہاں — برف والی الماری میں۔

راجو: (بات کاٹ کر) برف والی الماری؟

چچامیاں: (جھنجھلا کر) اماں وہی ریفری جریٹر — ہاں تو اس میں دیکھیو، دہی رکھا ہوگا۔

راجو: دہی؟

چچامیاں: ہاں ہاں، دہی — پرگتی بیٹی سے کہیو کہ تھوڑا اسا رایتہ، لوکی کا بنا لیں۔ یا کھیرے کا — یا مولی کا۔

راجو: جی صاحب۔

[جاتا ہے]

[پس منظر سے مضحکہ خیز موسیقی کی لہر]

فیڈ آوٹ

فیڈ ان

[کال بیل بجتی ہے۔]

چچامیاں: (پکارتے ہوئے) راجو، او راجو۔

[راجو آتا ہے]

راجو: جی صاحب۔

چچامیاں: ذرا دیکھیو تو یہ کھانے کے وقت اچانک کون منحوس آن پہنچا۔ یہ بھی کوئی وقت ہے کسی کے یہاں آنے جانے کا۔

[کال بیل پھر بجتی ہے]

چچامیاں: دیکھ راجو — اگر کوئی ایسا ویسا ملنے والا ہو تو چلتا کر دیجیو۔ کہیو کہ راشد اور

سلطانہ دونوں باہر گئے ہوئے ہیں۔ سمجھے ۔؟ ایسا نہ ہو کہ اندر آدھمکیں۔ اور انھیں رخصت کر کے کھانا لگانے میں پرگتی بیٹی کی مدد کیجیو۔ سمجھے؟

[دروازے کی طرف جاتا ہے۔ ملے جلے قدموں کی آوازیں۔ قریب آتی ہوئی۔]

چچامیاں : ورما ۔ دیکھا اس احمق کو انھیں اندر لیے چلا آرہا ہے۔ اب تین نفر کے کھانے میں اگر چوتھا بھی شامل ہو جائے تو۔

ورماجی : ہاں چاچاجی۔ یہ تو بڑی گڑبڑ بات ہے۔

چچامیاں : پتا نہیں کون اٹھائی گیرے ہیں۔ راجو نے بہانہ بنایا ہوگا۔ مگر ڈھٹائی دیکھو۔ اندر چلے آرہے ہیں۔ (دھیرے سے) لگتا ہے پرگتی بیٹی جو کھانا تیار کر رہی ہیں اس کی خوشبو ان کم بختوں تک پہنچ گئی۔

[قدموں کی آوازیں بالکل قریب سنائی دیتی ہیں]

چچامیاں : ششش! (دھیرے سے) لاشد کے کوئی دوست ہوں گے۔ ہوسکتا ہے تمھیں بھی جانتے ہوں۔ چائے کے لیے زیادہ اصرار مت کرنا۔

ورماجی : (دھیرے سے) اچھا۔

چچامیاں : اور کھانا ہم ان کے جانے کے بعد کھائیں گے۔ سمجھے۔ شی ۔ چُپ!

[موسیقی کی ایک تیز لہر]

راشد صاحب:] (ایک ساتھ) ارے ورما! تم یہاں چھپے بیٹھے ہو۔ ہم تو تمھاری طرف گئے
سلطانہ :] تھے۔

چچامیاں : (بوکھلا کر) یعنی کہ، یعنی کہ تم نے کھانا باہر نہیں کھایا۔ ؟ راشد ؟ سلطانہ ؟

ورماجی : تم دونوں ہماری طرف گئے تھے۔

سلطانہ : پرگتی کو کہاں چھوڑ آئے۔

ورماجی : پرگتی ؟

چچامیاں : یعنی کہ پرگتی بیٹی ؟

راشد صاحب : جی چچا میاں ۔ کیوں ورما ؟

ورماجی : پرگتی تو کچن میں ہے۔

راشد صاحب: کچن میں؟ مگر تمھارے گھر پر تو تالا پڑا ہوا تھا۔
ورما جی: ہمارے کچن میں نہیں، تمھارے کچن میں۔
سلطانہ: (حیرانی سے) ہائیں ___ (پکارتے ہوئے) راجو، او راجو۔ (دھیمی آواز میں) پانی! ایک گلاس ٹھنڈا پانی۔
راشد صاحب: (کمزور لہجے میں) اور میرے لیے بھی ___ پانی، پانی۔
[پس منظر سے مضحکہ خیز موسیقی کی ایک لہر]
فیڈ آؤٹ

وقفہ

[دروازے پر دستک]
راشد صاحب: کون؟ سلطانہ؟
سلطانہ: جی! (طنز سے) آپ کی مشقت ابھی ختم نہیں ہوئی؟
راشد صاحب: بس بس۔ پانچ منٹ میں مسئلہ حل سمجھو!
سلطانہ: اتنی ذلت اٹھانے کے بعد بھی آپ کو ہوش نہیں آیا۔
راشد صاحب: ذلت؟ کیسی ذلت؟
سلطانہ: ورما جی اور پرگتی نے بھی سوچا ہوگا کہ کسی یتیم خانے میں آ نکلے ہیں۔
راشد صاحب: یتیم خانہ؟
سلطانہ: اور نہیں تو کیا؟ باورچی خانے میں جھاڑو پھری ہوئی تھی۔ کتنا کہا تھوڑا تھوڑا سامان منگوالیں، ہر چیز موجود ہونی چاہیے۔ وقت ناوقت کوئی بھی آسکتا ہے۔ مگر۔
راشد صاحب: مگر کیا؟
سلطانہ: آپ تو اپنے آپ کو بجٹ کا ماہر سمجھتے ہیں۔ آپ نے ناحق ایک درجن ٹکیاں صابن کی منگوالیں۔ شیونگ کریم، بلیڈ، سگریٹوں کے کارٹن، میں کہتی ہوں ایک ساتھ تھوک کے بھاؤ منگوانے کی ضرورت کیا تھی؟
راشد صاحب: (بڑی سنجیدگی کے ساتھ) اوہ! یہی تو تم سمجھتیں نہیں۔ تم کو معلوم ہے۔ نئے بجٹ کے بعد ان چیزوں کے دام کتنے بڑھ گئے؟ اب ذرا حساب لگاؤ۔ چھے مہینے تک ہمیں سگریٹ، صابن، بلیڈ، کچھ بھی منگوانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اور یہ سب چیزیں

ہمیں پرانے داموں مل گئیں۔ ذرا سوچو ___ کتنی بچت ہوگئی۔

سلطانہ : بچت، بچت، بچت ___ میرے خدا!

راشد صاحب : (اپنی رو میں) جمع خرچ کا BALANCE اسی طرح ٹھیک رہ سکتا ہے۔ چائے کی ایک پیالی کم کر دینے سے مہینے میں چالیس پچاس روپے کی بچت کر سکتے ہیں۔

سلطانہ : جی ہاں! کیا کہنے ہیں؟

راشد صاحب : اور ہاں، ہماری روز کی غذا میں سبزیاں زیادہ ہونی چاہئیں۔ گوشت ہفتے میں بس ایک بار ___ پہلے ہفتے میں چار روز گوشت پکتا تھا ___

سلطانہ : پھر؟

راشد صاحب : پھر کیا؟ سو روپے مہینے سے زیادہ کی بچت اسی ایک چیز میں ہوگئی۔

سلطانہ : مگر باورچی خانے میں انڈے، گھی، مصالحے یہ سب تو ہونے چاہیے تھے۔ پرگتی نے کبھی کیا سوچا ہوگا۔

راشد صاحب : نہ نہ نہ نہ نہ ___ تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں ورما کو سمجھا چکا ہوں۔ اُسے پتا ہے انڈے سے کولسٹرال بڑھتا ہے۔ مسالے اور چکنائی ___ یہ سب نقصان کرنے والی چیزیں ہیں۔ اُبلا کھانا اچھی صحت کی ضمانت ___

سلطانہ : تو آپ نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ چچا میاں کو بھی صحت بنانے کا جنون ہے؟ جو مہمان آئے گا۔ وہ بھی پرہیز کی عادت کا مارا ہوگا؟

راشد صاحب : سلطانہ! یہ بھی تو سوچو کہ جو چیز ہمارے لیے نقصان دہ ہے، ہمارا فرض ہے کہ دوسروں کو بھی اس سے بچائیں۔

سلطانہ : (جھنجھلا کر) صاف کہتے کیوں نہیں کہ پرہیز ورہیز ڈھکوسلہ ہے۔ یہاں بھی آپ وہی جمع خرچ کے حساب میں الجھے ہوئے ہیں۔

راشد صاحب : میں کہتا ہوں۔ اس میں بُرائی کیا ہے؟ تمھیں کچھ اندازہ ہے، گھی اور مصالحے اور انڈے اگر الگ کر دیئے جائیں تو مہینے میں کم سے کم چار سو کی بچت ہو جاتی ہے۔ میں تو اب دفتر بھی پیدل جایا کروں گا۔

سلطانہ : کیوں؟

راشد صاحب : پیدل چلنا ہاضمے کے لیے بہت اچھا ہے۔ پھر پٹرول کی بچت سے ہمارے

اخراجات میں کم سے کم دو سو کی بچت ہے کہ نہیں؟

سلطانہ: (بیزاری سے) مجھے ایسی بچت نہیں چاہیے کہ دوسروں کی نظر میں آدمی ہمیشہ کے لیے آبرو گنوا بیٹھے۔ پرگتی نے سوچا ہوگا۔ یہ لوگ ویسے تو رئیس زادے بنتے ہیں، مگر ایک وقت ڈھنگ کا کھانا بھی کسی کو نہیں کھلا سکتے ـــ مجھے تو اُس سے آنکھ ملاتے بھی شرم آرہی تھی۔ ورما جی کا چہرا دیکھا تھا آپ نے؟

راشد صاحب: کیا تھا اُن کے چہرے میں؟

سلطانہ: ایسا لگتا تھا ہماری ہنسی اُڑا رہے ہیں۔ اور تو اور، چچا میاں بھی جب سے روٹھے ہوئے ہیں۔

راشد صاحب: چچا میاں ـــ افوہ ـــ ارے بھئی یہ پرانے وقتوں کے لوگ بجٹ اور بچت کا تعلق کیا جانیں؟ لاکھوں کی جائداد ٹھکانے لگا دی۔ اُنھیں دونوں وقت مرغ چاہیے۔ کباب چاہیے۔ پلاؤ چاہیے۔ فیرنی چاہیے۔

سلطانہ: اور ـــ (اشتیاق آمیز لہجے میں) اور؟

راشد صاحب: (اسی اشتیاق آمیز لہجے میں) مچھلی تلی ہوئی۔ پسندے۔

سلطانہ: اور؟ اور؟

راشد صاحب: بگھارے بینگن ـــ کچی بریانی ـــ زردہ اور مُزعفر۔

سلطانہ: ندیم بھائی کا باورچی قیامت کا ہے۔ یاد ہے۔ پچھلی بار ان کے یہاں کیسی مزے کی بریانی کھائی تھی۔

راشد صاحب: کوفتے کھائے تھے۔

سلطانہ: شیر برنج۔

راشد صاحب: اور قورمہ۔

سلطانہ: (دھیرے سے) بہت دن ہوئے اُن سے ملے۔ کیوں نہ ہم آج شام کو ان کے یہاں چلیں۔

راشد صاحب: (دانت کچکچا کر) ارے کہیں ورما کے یہاں والا حال نہ ہو۔ ہم کیا سوچ کر اُن کے گھر گئے تھے۔ وہ ہم سے زیادہ ہوشیار نکلے۔

سلطانہ: مگر ندیم بھائی ـــ ان کا باورچی گلاوٹ کے کباب کتنے اچھے بناتا ہے۔

راشد صاحب: تو ـــ ٹھیک ہے۔ شام کو انہی کے یہاں چلتے ہیں۔ ویسے بھی دوستوں کو ایک دوسرے کی خبر لیتے رہنا چاہیے۔ ذرا جلدی نکل لیں گے۔ وہ بہت سیدھے آدمی ہیں۔ بھلا کیا جانیں۔ بجٹ اور بچت کا حساب!

سلطانہ: تو کہہ دوں راجو سے۔

راشد صاحب: ہاں ہاں، کہہ دو!

سلطانہ: راجو ـــ او راجو۔

[دوڑتا ہوا آتا ہے]

سلطانہ: ایسا ہے کہ شام کو ہمارے لیے کھانا نہیں پکے گا۔ ہم دونوں کو ذرا باہر جانا ہے۔

راجو: جی بیگم صاحب۔

راشد صاحب: اور ہاں، کوئی بھی آئے روک مت لینا ـــ سمجھے۔

[چچامیاں کے قدموں کی آہٹ، قریب آتی ہوئی]

چچامیاں: راشد، سلطانہ؟

راشد صاحب: جی چچامیاں؟

چچامیاں: تم دونوں شام کو کہیں جارہے ہو؟

سلطانہ: جی چچامیاں، ذرا ندیم بھائی کے گھر تک۔ سنا تھا وہ بیمار ہیں۔ کہیں گے دیکھنے بھی نہیں آئے۔

چچامیاں: بیمار ہیں ندیم؟

راشد میاں: جج ـــ جی ہاں۔

چچامیاں: کیا ہوا ہے انھیں؟

سلطانہ: (گڑبڑا کر) ہاضمہ، ہاضمہ خراب ہے ان کا۔

چچامیاں: (ہنس کر) اونہہ، یہ بھی کوئی بیماری ہے، چٹکی بجاتے میں اس کا علاج کردوں گا۔ ایسا ہے کہ میں بھی تم دونوں کے ساتھ چلا چلوں گا۔ بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی۔ سوچتے ہوں گے۔ یہ کیسے چچا ہیں۔ بھتیجے کی خبر تک نہیں لیتے۔ میاں! دنیا سے وضع داری اُٹھ گئی۔

راشد صاحب: (کمزور لہجے میں) جی چچامیاں!

چچامیاں : تو ہم بھی چل رہے ہیں تمہارے ساتھ۔
سلطانہ : جی۔
راشد صاحب : (پکارتے ہوئے) راجو ـــ راجو ـــ چچامیاں کا کھانا بھی نہیں پکے گا شام کو ـــ سمجھے ـــ
چچامیاں : (چونک کر) لک، کیوں ؟
راشد صاحب : (گڑبڑاکر) وہ چچامیاں ! مطلب یہ کہ۔
چچامیاں : اوہ ! سمجھ گئے، سمجھ گئے ہم۔
سلطانہ : (گھبراکر) کیا سمجھ گئے چچامیاں ؟
چچاجان : ہم سمجھ گئے، سمجھ گئے۔ سب کچھ سمجھ گئے۔
راشد صاحب : (سنجیدگی سے) سلطانہ۔
سلطانہ : جی ـــ ی ی ی ـــ ؟
راشد صاحب : ہم بلاوجہ شرماتے ہیں، ایک دوسرے سے، سچ تو یہ ہے کہ زمانہ ـــ
چچامیاں : (جلدی سے) ارے میاں کہاں کا زمانہ ؟ کیسا زمانہ ؟ زمانہ ہم سے الگ تو کوئی چیز نہیں۔ ہم شروع سے جیسے تھے، ویسے تھے۔ بس تم ہی کو الگ دکھائی دیتے تھے۔ ہم میں سے کوئی کسی کو نہیں دیکھ پاتا۔ اور ہم سب اپنی اپنی چادر اپنے تن کے مطابق کھینچے کھانچتے رہتے ہیں۔ ہے کہ نہیں۔ کوئی کھل جاتا ہے۔ کوئی نہیں کھلتا۔ (ہنستے ہیں)۔

[خاموشی]

(پس منظر سے سود پر ایک گمبھیر گت)

فیڈ آؤٹ

△△

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں

آوازیں:

مرزا صاحب	عمر تقریباً پچاس برس
شکیلہ بیگم	مرزا صاحب کی بیگم
رحمٰن صاحب	عمر تقریباً پچاس برس
حسنیٰ بیگم	رحمٰن صاحب کی بیگم
کلیم	مرزا صاحب اور شکیلہ بیگم کے بیٹے
عالیہ	مرزا صاحب اور شکیلہ بیگم کی بیٹی
منّا	عالیہ کا چھوٹا بھائی
آپا جان	شکیلہ بیگم کی بڑی بہن
دولھا بھائی	شکیلہ بیگم کے بہنوئی

بازار میں نیند

(ابتدائی موسیقی۔ نشاط یادر مضحکہ خیز ـــ فیڈ آؤٹ کے ساتھ ہی کتوں کے بھونکنے کی آواز ـــ تانگے کے پہیوں کی چرمراہٹ۔ گھوڑے کی ٹاپیں اور گھونگروؤں کی جھنکاریں۔)

(اچانک دو بچے ایک ساتھ رونے لگتے ہیں۔)

مرزا صاحب: (بگڑ کر) چپ! چپ! میں کہتا ہوں چپ ہوجاؤ۔

(بچے اور زور سے رونے لگتے ہیں۔)

مرزا: (زچ ہوکر) لاحول ولا قوۃ۔ میں کہتا ہوں بند کرو یہ ملہار۔ یہ کون سا وقت ہے راگ الاپنے کا۔

(رونے کی آواز تیز تر ہوجاتی ہے)

مرزا: (چیخ کر) چوپ۔ چوپ ہوجاؤ بدبختو! نہیں تو سارا محلّہ جاگ جائے گا۔

شکیلہ بیگم: لو ج ہے۔ تم اس طرح چپ کراؤ گے تو منا اور منی کاہے کو چپ ہوں گے۔ بھلا یہ بھی کوئی طریقہ ہے روتے بچوں کو چپ کرانے کا میں کہتی ہوں، منے او منے چپ ہوجاؤ بیٹے ـــ او عالیہ! ذرا منی کو سنبھالے رکھو۔ دیکھ تو کیسی بے حال ہو رہی ہے۔

عالیہ: (چپ کرانے کے لیے چمکارتی ہے) چہ چہ چہ چہ۔ چہ چہ چہ چہ۔ چہ چہ چہ.....

(منی روتی ہے۔ منے کی سسکیاں)

(گھوڑا ہنہناتا ہے)

مرزا: گھر بھی تو اس اللہ کے بندے نے کہاں لے رکھا ہے؟ پورے تیس منٹ ہوچکے بس اڈے سے چلے ہوئے۔

شکیلہ: (چمک کر) میں نہ کہتی تھی کہ اللہ کا نام لے کر چپ چاپ گھر میں بیٹھو۔ مگر تمھیں تو رٹ لگی ہوئی تھی۔ بچوں کے امتحان ختم ہو چکے تھے تو کیا ہوا۔ چین سے اپنے گھر میں رہتے۔

مرزا: جی ہاں! بڑا چین تھا گھر میں! صبح سے شام تک آٹے دال کا چکر۔ یہ لاؤ۔ وہ لاؤ۔ اسے نزلہ ہے۔ اسے زکام ہے۔ میں نے سوچا کچھ دن تو بے فکری سے گزر جائیں۔

شکیلہ: کیا کہنے ہیں اس بے فکری کے۔ لو، دھوپ میں دن بھر جھلستے رہے۔ صبح کے نکلے ہوئے ہیں گھر سے۔ پورے سوا سو روپے کرائے پر اُٹھ گئے۔ خدا کی پناہ۔ کس قیامت کا سفر تھا۔ بس کا انجن، وہ تو کہو کہ خدا خدا کر کے گھنٹے بھر میں درست ہو گیا۔ نہیں تو ابھی بھٹک رہے ہوتے۔ لعنت ہے ایسے سفر پر۔

مرزا: تو گویا کہ میں نے ہاتھ جوڑے تھے! بنتی کی تھی تمھاری !! پاؤں پڑے تھے!!! ارے میں نے تو سوچ سمجھ کر رائے دی تھی۔ کچھ روز تمھارے دولھا بھائی کے یہاں مہمانی کر لی جائے۔ تم کہہ دیتیں کہ نہیں۔

شکیلہ: تو کیا میں نے روکا تھا۔۔۔

مرزا: (بھنا کر) جی ہاں روکا تھا۔ مگر یہ نہ سوچا کہ پچھلے سال تمھاری آپا جان نے گرمیوں کے دو مہینے غریب خانے پر معہ پانچ عدد بال بچوں کے ٹھاٹ سے گزارے تھے۔ ناشتے میں انڈے، پراٹھے، سوجی کا حلوہ، صبح و شام دونوں وقت کے کھانے پر کباب، قورمہ، مرغن۔ ہفتے میں کم سے کم ایک روز پلاؤ اور فیرنی، کھاٹ کھڑی کر دی ہماری۔ لالہ کا حساب اس مہینے دوگنا ہو گیا اوپر سے اس کا قرض۔

شکیلہ: غضب خدا کا۔ چار روز کسی کو دو نوالے کھلا دیئے تو اب اس کا حساب نکال رہے ہیں۔

مرزا: میں کہتا ہوں اے نیک بخت۔ آخر اس میں بُرائی کیا ہے۔ کیا حرج ہے بھلا۔ بس تمھاری آپا جان ہی کو مہمانی کا حق ہے۔ ہمیں نہیں ہے حق اس بات کا۔ کھلایا ہے تو کھائیں گے بھی۔

شکیلہ: دوسرے کے حلوے مانڈے پر میری رال نہیں ٹپکتی میں اپنی روکھی سوکھی میں خوش رہتی ہوں۔ خدا کی پناہ آٹھ آٹھ نفر کا قافلہ وہاں پہنچے گا تو کیسا لگے گا؟

مرزا: اور وہ جو سات جنے ہمارے سر پر قہر بن کر ٹوٹے تھے۔

شکیلہ: تو اس کا بدلہ لے رہے ہو ہے نا؟

مرزا : ہاں ہاں بدلہ لے رہا ہوں، کیوں نہ لوں۔ اب بات آگے نہ بڑھاؤ۔ خدا کی قسم پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔ انتڑیاں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں۔

شکیلہ : خدا کے لیے دولھا بھائی کے گھر پہنچ کر یہ نہ کہہ دینا۔ مجھے پتا ہے کہ وہ لوگ مغرب بعد ہی کھا پی کر لیٹ جاتے ہیں۔

(گھوڑے کی ہنہناہٹ)

مرزا : تو کیا وہاں پہنچ کر بھی بھوکے رہیں گے؟

شکیلہ : میں تو کہہ دوں گی کہ راستے میں کھا پی چکے ہیں۔ اب تو صبح کو دیکھا جائے گا۔

مرزا : مم میں تو صاف کہہ دوں گا کہ مجھے کھانا چاہیے۔

(منّا رونے لگتا ہے)

مرزا : چپ، چپ!

شکیلہ : غریب کو بھوک لگی ہوگی۔ ڈانٹ کیوں رہے ہو؟

مرزا : اور مجھ غریب کو بھوک نہیں لگی ہے کیا؟ اے میاں تانگے والے دیکھو تو۔ وہ نیم کا پیڑ آیا کہ نہیں۔۔۔ بس اس کے آگے والا مکان ہے۔

(منّا روتا ہے۔ تانگہ ٹھہر جاتا ہے۔ سب کے سب نیچے اترتے ہیں۔)

مرزا : اچھی طرح دیکھ لو! سب ہیں نا! منا، منی، عالیہ، نازیہ، کلیم، علیم۔

شکیلہ : توبہ ہے۔ تم تو لگتا ہے حاضری لے رہے ہو۔ میں اسباب اتروا تی ہوں۔ تم ذرا زنجیر کھٹکھٹاؤ۔

(مرزا صاحب دروازے کی طرف بڑھتے ہیں)

مرزا : (دور سے) ز زنجیر۔ ز زنجیر۔ بب بیگم۔ ارے بیگم۔

شکیلہ : (جھنجھلا کر) کیوں گلا پھاڑ رہے ہو۔ آتے ہیں، آتے ہیں۔

مرزا : یہاں تو قفل پڑا ہوا ہے۔

شکیلہ : کک کیا؟ ق قفل۔ ایں؟

(منّا رونے لگتا ہے۔ کتے بھونکتے ہیں۔)

(مضحکہ خیز موسیقی کی ایک لہر)

فیڈ آؤٹ

(فیڈ ان)

(ملے جلے قدموں کی چاپ قریب آتی ہوئی)

شکیلہ: یا خدا۔ کمر تختہ ہوگئی۔ گھنٹے بھر سے دروازے پر بیٹھے ہیں۔

مرزا: (دھیرے سے) ذرا آہستہ بولو۔ شاید کوئی اور ہے۔

شکیلہ: (دھیرے سے) اور کون ہوگا؟ کیا میں گن نہیں سکتی۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات۔ کل سات نفر ہیں۔ وہی لوگ ہیں۔ آپا جان کا خاندان۔

(قدموں کی چاپ اور قریب آتی ہے)

مرزا: (گھبرا کر) کک۔ کون۔ کون صاحب ہیں؟

رحمٰن صاحب: خاکسار کو رحمٰن علی خاں کہتے ہیں۔ معاف کیجیے گا۔ حکیم نبی بخش کا دولت کدہ یہی ہے نا! کہیں ہم غلط تو نہیں آگئے۔

شکیلہ: (آہ بھر کر) یا اللہ!

مرزا: (جلدی سے) جی جی ہاں! میرے ہم زلف ہیں حکیم نبی بخش صاحب یہی مکان ہے۔ لل لیکن آپ؟

رحمٰن: میں ان کا پرانا دوست ہوں ۔۔ مم مگر۔ آپ لوگ یہاں کیوں بیٹھے ہیں۔

مرزا: (جھنجھلا کر) تو کیا قفل توڑ دوں۔ نقب لگاؤں۔ دیوار پھاند جاؤں۔

رحمٰن: (گھبرا کر) قفل؟ تو آپ کا مطلب ہے قفل۔ یعنی کہ تالا؟

مرزا: جی ہاں! تالا پڑا ہوا ہے۔ لل لیکن آپ؟

رحمٰن: (دھیرے سے) حضرت! آپ کچھ بتا سکتے ہیں کہ حکیم صاحب کب تک واپس آئیں گے؟

مرزا: مم مجھے کیا پتا۔ میں تو خود نو وارد ہوں۔ مگر ۔۔ آآپ آپ لوگ۔

رحمٰن: (جلدی سے) یہ میری اہلیہ ہیں حسنیٰ بیگم اور یہ میرا بڑا بیٹا ہے سہیل۔ بارہویں میں پڑھتا ہے۔ ماشاء اللہ بہت ذہین ہے۔ اول نمبر سے پاس ہوا تھا دسویں میں ۔۔ اور یہ دوسرا بیٹا طفیل۔ اب کے نویں جماعت میں گیا ہے۔ کھلنڈرا ہے ذرا۔ میں کہتا ہوں کھیل کود سے زیادہ کام پڑھائی آئے گی۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اور یہ تیسرا بیٹا۔ وکیل خدا نے چاہا تو بیرسٹر بنے گا۔ بڑا قانونی مزاج پایا ہے اس نے۔ اور یہ ۔۔۔

مرزا: (غصہ دبانے کی کوشش کرتے ہوئے) افوہ! آپ تو اپنے خاندان کی تاریخ بیان کرنے لگے۔ میں پوچھتا ہوں کہ آپ ۔۔۔

رحمن : (جلدی سے) میں ضلع ہردوئی میں پیشکار ہوں۔ خدا کا دیا سب کچھ ہے گھر میں۔ زمین جائداد، آموں کا باغ۔ ابھی پچھلے برس آموں کی فصل۔

مرزا : (بات کاٹ کر) خدا کی پناہ۔ آپ وہی تاریخ بیان کرنے لگے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس وقت آپ سب یہاں کیسے تشریف لائے۔ اس زحمت کا سبب۔

رحمن : ارے جناب زحمت کیا۔ اپنوں سے تکلف کیسا۔ حکیم صاحب کا قدیمی نیازمند ہوں۔ گرمی کی تعطیلات تھیں۔ سوچا بچوں کو ذرا لکھنؤ کی سیر کرا دوں۔ اس شہر میں جب بھی آنا ہوتا ہے حکیم صاحب کی میزبانی کا لطف اُٹھاتا ہوں۔ بڑے وضع دار بزرگ ہیں۔ بچپن کے دوست ہیں، کہیں اور جانے نہیں دیتے۔ مگر اس وقت یہ قفل۔

مرزا : (طنزاً) جی ہاں۔ اس وقت تو قفل پڑا ہے اپنی قسمت پر۔ ہم گھنٹے بھر سے یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ دن بھر کا سفر۔ اس پر یہ انتظار کی مصیبت۔

رحمن : تو کیا آپ لوگ بھی باہر سے تشریف لائے ہیں۔

مرزا : جی ہاں، خاکسار کا وطن فیض آباد ہے۔

رحمن : سبحان اللہ! کیا کہنے ہیں فیض آباد کے وہاں کے امرودوں کا جواب نہیں۔ اور صاحب چوک کے بازار میں عیدو حلوائی کی دکان ابھی وہاں ہے نا! اس کے یہاں کیا نفیس بالائی ملتی ہے۔ اب بھی ملتی ہوگی۔ کیوں؟

مرزا : (طنزاً) جی ہاں! ملتی ہے۔ کبھی فیض آباد تشریف لایئے تو کھا لیجیے گا۔ لیکن اس وقت تو یہ قفل۔

رحمن : کیا قیامت ہے۔ ہمیں تو اسٹیشن سے یہاں تک پیدل آنا پڑا۔ کوئی یکہ تانگہ بھی نہیں ملا۔ اور اب یہ مصیبت۔

مرزا : جی ہاں عجیب مصیبت ہے۔ خدا جانے کہاں گئے ہوئے ہیں یہ لوگ۔

رحمن : میرا خیال ہے کسی تقریب میں گئے ہوں گے۔ کسی دعوت میں یا شادی بیاہ میں۔ اڑا رہے ہوں گے پلاؤ قورمہ۔ شاہی ٹکڑے۔ کباب، قلیہ، شیرمال، نان۔

(منّا رونے لگتا ہے)

رحمن : میرا خیال ہے کہ صاحبزادہ بھوک سے نڈھال ہو رہا ہے۔

مرزا : بھوک سے تو اس کا باپ بھی نڈھال ہو رہا ہے۔ پھر یہ کیوں نہ ہوگا۔

رحمن : تو کیا حکیم صاحب کو آپ کی آمد کا پتا نہیں تھا۔

مرزا : جی نہیں۔ وہ میرے عزیز ہیں۔ انھیں اطلاع دے کر آنے کی کیا ضرورت تھی ہیں۔ لل لیکن آپ ؟

رحمن : میں نے تو خط لکھ دیا تھا حکیم صاحب کو کوئی چار روز پہلے۔ حیرت ہے شاید خط نہیں ملا ورنہ اس وقت گھر پر ہوتے دعوت میں جانا ایسا ہی ضروری ہوتا تو ہماری آمد کے بعد ہمیں ساتھ لے کر جاتے۔ اڑا رہے ہوں گے مرغ، بریانی، کباب، قورمہ زردہ۔

مرزا : شاید آپ بھی بھوکے ہیں؛ ہیں نا؟ سفر میں۔

رحمن : جی ہاں، سفر میں بُرا حال ہوگیا ہے ہمارا۔ خیر اب انتظار کے سوا چارہ کیا ہے۔ یوں ہم نے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے بہت ڈٹ کر خاگینہ اور روغنی روٹی اور کباب اور آلو کی ترکاری...

مرزا : حضت۔ آپ بہت بھوکے معلوم ہوتے ہیں۔

(منا رونے لگتا ہے۔ مضحکہ خیز موسیقی کی ایک لہر)

(فیڈ آؤٹ)

(فیڈ ان)

(پس منظر میں ریلوے اسٹیشن کا شور۔ انجن کی چھک چھک۔ قلیوں کی آوازیں۔)

حسنیٰ بیگم : (جمائی کے ساتھ) یا اللہ۔ ہر حال میں تیرا شکر ہے۔ یہ عذاب بھی اپنی قسمت میں لکھا تھا۔

شکیلہ : اے بہن شکر کرو کہ کسی طرح لشٹم پشٹم اسٹیشن پہنچ گئے۔ اے یہاں کم سے کم آدمی زادوں کی صورت تو نظر پڑ رہی ہے۔ اس ویرانے میں کب تک پڑے رہتے۔

حسنیٰ : ہاں اور نہیں تو کیا۔ دو گھنٹے حکیم صاحب کی ڈیوڑھی کے دربان بنے رہے۔ میں تو رحمن صاحب سے پہلے ہی کہتی تھی کہ اپنے گھر بیٹھیں۔ مگر انھیں تو سیر تفریح کی سوجھی تھی دیکھ لیا اس کا انجام۔ بھر پایا۔ اب ہمیشہ کے لیے کان پکڑتی ہوں۔ اور تم بھی مرزا صاحب سے کہو کہ آگے کے لیے توبہ کرلیں۔

شکیلہ : میرا خیال ہے کہ دولھا بھائی اور آپا جان کہیں باہر چلے گئے ہیں۔ ورنہ اب تک تو واپس آگئے ہوتے۔

حسنیٰ : لیکن ہمیں پاس پڑوس میں کسی سے پوچھ لینا چاہیے تھا۔

شکیلہ: پوچھتے کس سے۔ پڑوس میں جو صاحب تھے، انھیں کچھ اتا پتا نہیں تھا۔ پھر کیا کرتے۔ سوائے اس کے کہ تھک ہار کر اسٹیشن آ گئے۔ آپ کو ہردوئی کی گاڑی کب ملے گی؟

حسنیٰ: سویرے پانچ بجے۔

شکیلہ: اور ہماری گاڑی چھ بجے آئے گی۔ فیض آباد کے لیے۔

حسنیٰ: کب سے تمباکو کی طلب لگی ہوئی ہے۔ موئے یہ اسٹیشن کے پان والے چار آنے کی ایک گلوری دیتے ہیں۔ پان بھی ایسے جیسے بکری کا پتّا چبا رہے ہوں۔ خدا کی مار پڑے اُٹھائی گیروں پر۔

رحمٰن: (دور سے) یہ کس پر خدا کی مار بھیج رہی ہو حسنیٰ بیگم۔

حسنیٰ: (خفا ہو کر) بس بس بیٹھے رہیے۔ آپ ہی کی ضد نے یہ دن دکھایا، نہیں تو اپنے گھر میں چین سے خراٹے لے رہے ہوتے۔ پھر میں تو کہتی ہوں کہ کیا عجب ہمارے چلتے ہی حکیم صاحب آ گئے ہوں۔

رحمٰن: تو کیا ڈگڈگی پٹواتا۔ شہر میں منادی کرواتا۔ پڑوسی کو کچھ خبر نہیں تھی۔ کیا ضروری ہے کہ حکیم صاحب شہر بھر میں اعلان کرنے کے بعد کہیں گئے ہوں۔ کہیں آس پاس دعوت تقریب میں گئے ہوتے تو گیارہ بارہ بجے تک لوٹ آئے ہوتے۔

حسنیٰ: تو میں کب کہتی ہوں کہ وہ شہر میں ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہیں مہمانی کے مزے لے رہے ہوں۔ بال بچوں سمیت کسی عزیز رشتے دار کی طرف نکل گئے ہوں۔

شکیلہ: گئے برس تو وہ انہی دنوں ہمارے یہاں آئے تھے۔ بال بچوں سمیت۔ ابھی پچھلے ہفتے ان کا خط مرزا صاحب کے پاس آیا تھا۔ اس میں تو کہیں جانے کا ذکر نہیں تھا۔ شاید اچانک ہی چل پڑے۔ اللہ نہ کرے کوئی ایسی ویسی بات۔

مرزا: (دور سے) ارے، جہاں بھی ہوں گے چین سے ہوں گے ہماری جیسی حالت تھوڑی ہو رہی ہوگی۔ پلاؤ، قورمہ، کھا کر چین کی نیند سو رہے ہوں گے اس وقت اور ہم ہیں کہ اس نا بکار ریلوے اسٹیشن پر ایک پیالی چائے بھی۔۔۔

رحمٰن: اجی مرزا صاحب لاحول بھیجئے اس چائے پر۔ حقّے کا پانی معلوم ہوتی ہے۔ میرا تو مُنہ کا مزہ بگڑ گیا۔ اسی لیے تو میں نے آپ کو پیش نہیں کی۔ کہیے تو۔

مرزا: معاف فرمائیے مجھے رحمٰن صاحب! میں نے تو وہ مٹر کی چاٹ کا دونا کوڑے دان میں پھینک

دیا۔ بہت بدمزہ تھا۔ یوں اگر آپ کہیں تو۔

شکیلہ: (دور سے) ذرا سنیے۔

(قدموں کی چاپ)

شکیلہ: کیا بات ہے بیگم۔

شکیلہ: (سرگوشی میں) یہ آپ دونوں ہاتھوں سے لٹانے پر کیوں تلے ہیں۔ مان لیجیے کہ موئے رحمٰن صاحب ہاں، کر دیتے تو۔ پورے سات نفر ہیں۔ سات دونے منگوانے پڑتے۔

مرزا: (سرگوشی میں) بہت کائیاں ہیں حضرت۔ اکیلے چائے پی لی۔

شکیلہ: کیوں نہ پیتے۔ آخر ہمارے ساتھ بھی فوج کی فوج ہے۔ منّے اور منّی کو چھوڑ دو جب بھی کم سے کم آدھی درجن پیالیاں ان کے متّھے جاتیں۔

مرزا: تم ایسا کرو بیگم (رازدارانہ انداز میں) وہ جو مٹھائی کا ڈبہ آپا جان کے لیے لائی ہو مجھے دیدو۔ ایک آدھ لڈو اسی میں سے کھالوں، خدا کی قسم حالت خراب ہے۔

شکیلہ: ہرگز نہیں۔ میں یہ لاکھ برس نہیں ہونے دوں گی۔ رحمٰن صاحب کی نظر پڑ گئی تو پورا ڈبّا صاف ہو جائے گا۔ ابھی ذرا دیر پہلے میں نے منّے کو ایک لڈو دیا تو سب ندیدوں کی طرح آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگے۔

مرزا: .... اچھا ٹھیک ہے۔ انھیں ہر دوئی کے لیے دفعان ہونے دو۔ اس کے بعد کھالیں گے۔

شکیلہ: ٹھیک ہے۔

(اسٹیشن کی گھنٹی بجتی ہے۔ گاڑی آتی ہے۔ پلیٹ فارم کا شور)

مرزا: رحمٰن صاحب۔ اجی او رحمٰن صاحب۔ حضت آپ تو اونگھ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ آپ کی گاڑی ہے۔

رحمٰن: (جمائی لے کر) میری گاڑی۔ جج جی ہاں حسنیٰ بیگم حسنیٰ بیگم۔

حسنیٰ: جی!

رحمٰن: (پکارتے ہوئے) سہیل۔ طفیل۔ وکیل...ا... ارے اٹھو تم سب گاڑی آگئی... چلو.... جلدی کرو۔

(ملی جلی آوازیں۔ خوانچہ فروشوں کی آوازیں)

مرزا: اچھا بھائی رحمٰن صاحب۔ خدا حافظ!

رحمن: خداحافظ۔
حسنیٰ: خداحافظ شکیلہ بہن۔ کیسی مسافرت کی ملاقات رہی۔
شکیلہ: خداحافظ حسنیٰ بیگم۔
(ریل گاڑی کی سیٹی بجتی ہے۔ انجن کی چھک چھک)
(فیڈ آوٹ)
(مضحکہ خیز موسیقی کی ایک لہر کے ساتھ کوے کی کائیں کائیں)
منا: (تتلاتے ہوئے) ابی جی کوا۔
مرزا: کیا بکتا ہے ناہنجار، باپ کا مذاق اُڑاتا ہے۔ اپنی صورت دیکھی ہے آئینہ میں۔
شکیلہ: ہے ہے۔ تم تو اس غریب کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے۔ وہ کیا غلط کہہ رہا تھا۔
مرزا: (ڈپٹ کر) شکیلہ بیگم یہ ہنسی دل لگی کا وقت نہیں ہے۔ مانا کہ میری رنگت بقول تمھارے اُلٹے توے جیسی ہے مگر خود تم کہاں کی حور پری ہو! ایں!
(عالیہ کی دبی دبی سی ہنسی)
شکیلہ: (فریادی لہجہ) یاخدا۔ رات اذیت میں کٹی۔ جیسے گئے تھے ویسے ہی اُلٹے پاؤں لوٹ آئے۔ اب گھر پہنچے ہیں تو یہ قیامت (اچانک چمک کر) اے میں کب کہتی ہوں کہ میں حور پری ہوں۔ لے آئے ہوتے کوئی ڈھونڈ کر۔ اشتہار چھپوایا ہوتا اخبار میں کہ اپنے جیسی سبز صورت...
مرزا: (چیخ کر) بس بیگم۔ خدا کی قسم چپ ہو جاؤ نہیں تو۔
(کوا کائیں کائیں کرنے لگتا ہے۔ عالیہ دور سے ہنستی ہے۔)
مرزا: (بگڑ کر) کھی کھی کھی۔ کھی کھی کھی۔ بتیسی نکلی ہوئی ہے۔ سور کہیں کی۔
شکیلہ: (روہانسی ہو کر) عالیہ۔
عالیہ: جی امی۔
شکیلہ: اری بدبخت ہوش میں آ نہیں تو یہ بھگا کر رکھ دیں گے۔ ان کی زبان کو لگام نہیں۔ کہتے ہیں میں حور پری نہیں ہوں۔ نہ سہی۔ خود کون سے یوسف زماں ہیں۔ غضب خدا کا۔ چھ چھ بچوں کے باپ اس پر یہ رنگ ڈھنگ یہ صلواتیں۔
مرزا: ہاں ہاں کہوں گا۔ سو دفعہ کہوں گا۔ اپنے چار برس کے لاڈلے سے کیوں نہیں کہتیں۔ بدتمیز کہیں کا، کہتا ہے ابی جی کوا۔

(کوّے کی کائیں کائیں)

شکیلہ: (اسی انداز میں) ارے تو کیا غلط کہتا تھا۔

مرزا: گویا کہ اب بیگم، اس لونڈے نے جو کہا، تم سمجھتی ہو کہ صحیح کہا۔

شکیلہ: ہاں ہاں صحیح کہا۔ دنیا جہان سے پوچھ لو۔ یہ چھت کی منڈیر پر کوّا نہیں تو کیا بلبل ترانے الاپ رہے ہیں۔

(کوّے کی کائیں کائیں)

مرزا: (دھیرے سے) اوہ تو یہ کوّے کو۔ گویا کہ اس منڈیر والے کوّے کو۔

شکیلہ: (جلدی سے) اور نہیں تو کیا۔

مرزا: (پھسلانے کے انداز میں) عالیہ بیٹی۔ میری بیٹی ذرا ایک کام کر۔

عالیہ: جی ابی!

مرزا: گھر میں کچھ گھی ہوگا؟

عالیہ: شاید ہے۔

مرزا: اور آٹا بھی ہے؟

عالیہ: شاید ہے۔

مرزا: (جھنجلاکر) یہ شاید شاید کیا لگا رکھا ہے۔

شکیلہ: ہے ہے۔ تم کیسی الٹی مت رکھتے ہو۔ ماشاء اللہ سے اتنے نفر کھانے والے۔ اگر تھوڑا بہت بھی بچا کھچا ہو تو غنیمت جانو۔

مرزا: تھوڑا بہت کیوں؟ ابھی ہفتہ بھر پہلے سیر بھر گھی میں خود لایا تھا۔ پندرہ سیر آٹا پسوایا تھا۔

شکیلہ: (سوالیہ لہجہ) تو؟

مرزا: تو کیا، وہ سب تم لوگ چٹ کر گئے ہفتہ بھر میں۔

شکیلہ: چٹ کریں میرے دشمن۔ میں تو صبح شام بس ایک ایک چپاتی کی گناہ گار ہوں۔

مرزا: تو کیا شیطان کھا گئے۔

شکیلہ: (غصہ میں) اب اپنے آپ کو جو چاہو نام دو۔

مرزا: (چیخ کر) کم مطلب؟ کیا مطلب ہے تمھارا؟

شکیلہ: خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہنا، سات دن صبح و شام تم نے پراٹھے اُڑائے ہیں کہ نہیں۔ میں

لاکھ کہتی تھی کہ گھر کا خرچہ بڑھ رہا ہے ہو مگر سو بات کا ایک جواب۔

مرزا : کک کیا جواب۔ کیسا جواب؟

شکیلہ : یہی کہ دو ہفتے آپا جان کے گھر تر مال ملے گا۔ اپنے گھر پر کچھ پکانے کی ضرورت کیا ہے۔ حلق تک ٹھونس ٹھونس کر پراٹھے کھائے گئے۔ دو ہفتے جو مفت خوری کرنی تھی۔ دوسرے کی جیب پر ڈاکہ ڈالنا تھا۔

مرزا : تو میں مفت خورا ہوں۔ میں چور ہوں۔ اچکا ہوں مُرْبھکّا ہوں۔

شکیلہ : تو میں غلط کہہ رہی ہوں؟ تم نہیں کہتے تھے کہ آپا جان کے یہاں مداراتیں ہوں گی۔ حلوے، پراٹھے، پلاؤ، قورمہ، فیرنی، (طنز سے) ماشاء اللہ خوب مل گیا۔

مرزا : (مصالحت کے انداز میں) پلاؤ، قورمہ، فیرنی، حلوے، پراٹھے۔ بیگم تمھاری باتیں سنتے ہی بھوک چمک اُٹھی۔ ذرا جلدی سے انتظام کرو۔ رات بھر پیٹ میں چوہے دوڑتے رہے۔ انتڑیاں قل ہو اللہ پڑھتی رہیں۔

شکیلہ : ذرا دم تو لے لو۔ ابھی گھر میں قدم رکھا ہے۔

مرزا : کلیم او کلیم۔

کلیم : جی ابی۔

مرزا : (ٹھہر کر) یہ لے دس روپے۔ بکّڑ کی دکان سے انڈے لے آ۔ اور پاؤ بھر گھی اور دو سیر آٹا۔ اور وہاں لالہ کی دکان پر اس وقت ترتراتی ہوئی جلیبیاں اتر رہی ہوں گی۔ آدھ سیر جلیبیاں بھی لیتے آنا۔

منّا : (بسورتے ہوئے) میں جلیبی کھاؤں گا!

مرزا : (ڈپٹ کر) کھالینا، کھالینا، نیت کے مارے ندیدے۔ ابھی جلیبیاں آئی نہیں اور رال ٹپکنے لگی۔ (منّا روتا ہے)

شکیلہ : (چمکارتے ہوئے) چہ چہ چہ۔ چپ ہو جاؤ بچّے۔ ابھی جلیبیاں منگوائی ہیں۔ سب سے زیادہ تم کو دوں گی۔

مرزا : کک کیا مطلب؟ تم میرے لیے۔

شکیلہ : (طنزاً) سچ کہنا ندیدا کون ہے؟ تم کہ منّا!

مرزا : ہاں ہاں میں ہی ندیدا ہوں۔ ٹھیک ہے۔ مم مگر جلیبیاں میں نے اپنے لیے منگوائی ہیں۔ بس

ایک ایک جلیبی ہر بچّے کو ملے گی۔

(منّا رونے لگتا ہے)

شکیلہ: (فریادی لہجہ) میرے خدا یہ کیسی مصیبت ہے۔ کمر لوٹ گئی اس موئے سفر میں۔ گھر پہنچ کر بھی وہی چخ چخ۔ عالیہ! بیٹی ذرا چولھا سلگا دے۔

عالیہ: جی امّی!

مرزا: او کلیم!

کلیم: جی ابی۔

مرزا: یہ لو دس کا نوٹ۔ میں نے کیا کیا کہا تھا لانے کے لیے۔

کلیم: انڈے۔

مرزا: اور؟

کلیم: اور گھی۔

مرزا: (رسیلے لہجے میں) اور؟ اور؟

کلیم: اور آٹا۔

مرزا: اور؟ اور؟

کلیم: جلیبیاں! آدھ سیر جلیبیاں۔

مرزا: (خوش ہو کر) شاباش۔ ہاں تو جلدی جا اور جلدی لوٹ آ۔ بیگم پراٹھے تم تلوگی۔ تمھارے ہاتھ میں جو مزہ ہے۔

شکیلہ: ترمال کا خیال آیا اور زبان سے شیرہ ٹپکنے لگا۔ زیادہ چونچلے مت بگھارو۔

مرزا: کلیم! اے کلیم۔ تو ابھی گیا نہیں۔ چیزیں لانے کے لیے۔

کلیم: جاتا ہوں ابّی جی!

(کلیم جاتا ہے)

مرزا: اور عالیہ۔ او عالیہ! بیٹی آگ جلا دے ذرا لپک کر۔

عالیہ: جلاتی ہوں۔

(عالیہ جاتی)

(وقفہ ۔ مضحکہ خیز موسیقی کی ایک لہر)

مرزا : دس منٹ سے زیادہ گزر گئے۔ کلیم ابھی واپس نہیں آیا۔
شکیلہ: اب ایسی بھی کیا بے صبری۔ آجائے گا۔ آجائے گا۔
مرزا : (پُرخیال انداز میں) ہاں آں۔ اصل میں لالہ کی دکان پر بھیڑ ہوگی۔ جلیبیوں کے شوقین بھیڑ لگا دیتے ہیں۔ اور خدا کی قسم کیسی سُرخ سرخ، گلابی گلابی، سوندھی سوندھی جلیبیاں تلتا ہے۔
منّا : (بسور کر) میں جلیبی کھاؤں گا۔
شکیلہ : ابھی گھر میں جلیبیاں آئی نہیں اور کھانے کی رٹ لگ گئی۔
(بیرونی دروازے پر ملے جلے قدموں کی چاپ ۔ گھوڑے کی ٹاپیں ۔ تانگہ رُکنے کی آواز۔ گھونگھرو بجتے ہیں)
مرزا : (گھبرا کر) بب بیگم۔ بب بیگم۔
شکیلہ : (جل کر) کیا ہے؟
مرزا : سس سن رہی ہو۔ سن رہی ہو نا! شاید ہمارے دروازے پر کوئی تانگہ رُکا ہے۔
شکیلہ: اونہہ۔ ہوگا کوئی پڑوس میں۔ تمھیں کاہے کی فکر لگی ہوئی ہے؟
مرزا : (مطمئن ہو کر) تم شاید ٹھیک کہتی ہو۔ میں تو ڈر گیا تھا۔ بلاوجہ ڈر گیا تھا۔ میں نے سوچا یہ صبح صبح کون اُٹھائی گیرا آن وارد ہوا۔
(بیرونی دروازہ کھلتا ہے۔ قدموں کی چاپ)
دولھا بھائی : (دور سے) ارے بھائی مرزا۔ یہ ہم ہیں۔ خوب سواگت کیا تم نے نہ سلام نہ دعا۔ کہہ رہے ہو یہ کون اٹھائی گیرا آن وارد ہوا۔
شکیلہ: (اچھل کر) دولھا بھائی۔
(پاس آتے ہوئے قدموں کی چاپ)
شکیلہ: اور آپا جان ۔! آداب۔
آپا جان : ہاں ہاں ہم ہیں۔ ہم ہیں۔ مگر کس پر صلواتیں بھیجی جا رہی ہیں۔ صبح صبح۔
منّا : (اچھل اچھل کر گاتے ہوئے) خالہ امی آگئیں، خالہ امی آگئیں۔ خالہ امی آگئیں۔
عالیہ : آداب خالہ امی!
مرزا : (گھبرا کر) مم مگر۔ مگر آپ لوگ؟

دولھا بھائی: ارے میاں مرزا۔ تم تو اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہو جیسے ہمارے سروں پر سینگ نکل آئے ہیں۔ خدا نہ کرے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے تمھاری؟

مرزا: ٹھٹ ٹھیک ہوں۔ ٹھیک ہوں۔ تو کیا آپ سب لوگ؟

دولھا بھائی: ہاں ہاں سب ہیں۔ رشید، وحید، سعید، طاہرہ، ہاجرہ تمھاری آپا جان سب ہیں۔ (ہنستے ہوئے) اما تو کیا بچوں کو یتیم خانے میں چھوڑ کر آتے؟

آپا جان: سچ جانو شکیلہ جب سے ان بچوں کے امتحان ختم ہوئے ہیں۔ ایک یہی رٹ لگی ہوئی تھی کہ خالہ جان خالو جان کے پاس چلو۔ بس ایک ہی رٹ کہ چلو۔ چلو۔

دولھا بھائی: میاں! مطب بند کرنے سے جو نقصان ہوتا ہے تم خود بھی سمجھ سکتے ہو۔ لیکن کیا کروں۔ بچوں کی ضد۔

آپا جان: ہاں اور نہیں تو کیا۔ بچوں کی ضد کے آگے ہم نے ہتھیار ڈال دیے۔ یہ تو خیر ہفتہ بھر رک کر چلے جائیں گے۔ بچے یہاں اپنی چھٹیاں گزار لیں گے۔

شکیلہ: مم مگر آپا جان۔

آپا جان: اے ہے۔ ذرا سکھ کا سانس تو لینے دو۔ اس سفر نے ہلکان کر دیا۔

شکیلہ: کس سفر؟

آپا جان: ہاں ہاں سفر جیسا سفر تھا؛ رات جنگل میں بسر ہوئی۔

مرزا: جج جنگل؟

دولھا بھائی: اما مجھ سے سنو۔ ہم تو کل شام ہی یہاں پہنچ گئے ہوتے۔ سات آٹھ بجے تک۔ مگر وہ کمبخت لاری تھی کہ کھٹارا۔ بیچ جنگل میں انجن نے جواب دے دیا۔ وہ تو کہو کہ تمھاری آپا جان تم سب کے لیے ایک ٹوکری زرد زرد دسہریوں کی، ایک شیشی نورتن چٹنی کی، ایک درجن باقرخانیاں تم سب کے لیے بہ طور سوغات لا رہی تھیں۔ اماں وہ مال تو ہمارے معدوں میں پہنچ گیا، نہیں تو بے موت مر جاتے۔ ذرا سوچو! جنگل، بیابان، گھر نہ دکان، بے بسی کا عالم۔ کوئی پُرسان حال نہیں۔ صبح ہوتے ہوتے انجن کے لیے دوسرا پمپ شہر سے آیا تو ہم روانہ ہوئے۔ پوری رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ تختے جیسی سیٹیں۔ میں تو کہتا ہوں اس لاری موٹر سے اپنی ریل بھلی۔ لل۔ لیکن (چونک کر) یہ تمھارا اسباب بندھا کیوں رکھا ہے۔ کیا کہیں جانے کی تیاری تھی؟

مرزا : (نڈھال ہوکر) نہیں بھائی صاحب کہیں نہیں۔ یہ تو ہم واپس آتے ہیں۔

دولھا بھائی : واپس۔ کہاں سے واپس۔

مرزا : لکھنؤ سے۔

آپا جان : (چونک کر) لکھنؤ۔ یعنی کہ لکھنؤ۔

دولھا بھائی : (بناوٹی غصے سے) لگ گگ کیا کہا لکھنؤ یعنی کہ ہمارا لکھنؤ! بہت خوب! بہت خوب!! جناب والا لکھنؤ کی سیر کر آئے اور ہمیں خبر نہ ہوئی۔ ہاں ہاں! ہم تو غیر ہیں۔ پرائے ہیں۔ اجنبی ہیں۔ (اچانک چپ ہو جاتے ہیں)

(کلیم اندر آتا ہے)

کلیم : خالہ امی آداب! خالو آبا آداب!

دولھا بھائی : (لہک کر) اوہو۔ کلیم میاں ہیں۔ اور دونے میں کیا ہے؟

کلیم : (شرماتے ہوئے) جلیبیاں ہیں۔

دولھا بھائی : جلیبیاں۔ یعنی کہ تازہ تازہ گرم گرم سوندھی سوندھی جلیبیاں۔ سبحان اللہ۔ ذہین بچے ہیں۔ ماشاء اللہ۔ اما مرزا۔ تو تمھیں خبر ہو گئی تھی ہمارے آنے کی پہلے ہی سے۔ بھئی واہ۔

(منڈیر پر کوے کی کائیں کائیں)

دولھا بھائی : (ہنس کر) اے میاں کوے۔ تمھیں جن کا انتظار تھا وہ آ گئے۔ ہم آ گئے۔ (ہنستے ہیں) کیوں مرزا کیسا رہا یہ شگون۔

مرزا : کک کلیم بیٹے۔ ذرا پپ پانی لاؤ۔ پانی۔ گلا خشک ہو رہا ہے۔

(منڈیر پر کوے کی مسلسل کائیں کائیں۔ اسی کائیں کائیں کی آواز پر مضحکہ خیز موسیقی کی ایک طویل لہر)

△△

دور پاس

آوازیں

۱۔ جمال صاحب	بوڑھے، بھاری، ٹھہری ہوئی آواز
۲۔ سکینہ بیگم	جمال صاحب کی بیگم
۳۔ بوا	خادمہ
۴۔ ممتا	خادم
۵۔ زرینہ	بیٹی
۶۔ سلیم	زرینہ کا شوہر

[افتتاحی موسیقی ــــ بہت تیز رفتار اور ڈراؤنی ہوا کے جھونکے۔ دور سے آتی ہوئی کسی کتے کے بھونکنے کی آواز۔]

جمال صاحب : (جیسے سوتے میں بڑبڑا رہے ہوں) اں ں آں ــــ کک ــــ کیا ہے؛ کیا ہے؛ کون ہے ؟ (زور سے) کون ــــ کون ــــ

[سوئچ آن کرتے ہوئے]

سکینہ بیگم : (چونک کر) کیا بات ہے؟ آپ کس سے باتیں کر رہے تھے؛ کیا ہوا؛

جمال صاحب : (بھرائی ہوئی آواز) کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا سکینہ بیگم۔ سو جاؤ۔

سکینہ بیگم : مگر آپ بھی تو سو جایئے۔

جمال صاحب : سو تو رہے ہیں۔

سکینہ بیگم : سو رہے تھے ؟ پھر یہ روشنی ــــ ؟

جمال صاحب : ہاں آں ــــ روشنی تو اُس وقت بھی بہت تھی جب ہم سو رہے تھے۔

سکینہ بیگم : نہیں۔ آپ ہی نے تو لائٹ آن کی تھی۔

جمال صاحب : ہم نے ؟ ــــ پتا نہیں۔

سکینہ بیگم : خواب تو نہیں دیکھ رہے تھے جمال ؟

جمال صاحب : نن نہیں تو ــــ کیسا خواب؟

سکینہ بیگم : (دھیمی ہنسی کے ساتھ) اب ہم کیا بتائیں ؟ خواب بھی کئی طرح کا ہو سکتا ہے۔ اچھا۔ بُرا۔ ڈراؤنا۔

جمال صاحب : (کھوئے ہوئے انداز میں) ہم مگر ــــ خواب دیکھنے کے لیے شاید سونا

ضروری ہوتا ہے۔ ہے کہ نہیں؟

سکینہ بیگم : (چونک کر) تو آپ سو نہیں رہے تھے؟ جی تو ٹھیک ہے آپ کا؟

جمال صاحب: ہاں۔ ٹھیک ہے۔ شاید ہم سو ہی رہے تھے۔

سکینہ بیگم : پھر بتی کیوں جلائی؟ نیند اچٹ گئی؟

جمال صاحب: ہاں۔ شاید۔ ایسا لگا بہت سے لوگ ہیں۔

سکینہ بیگم : خواب میں؟

جمال صاحب: پتا نہیں۔ ہو سکتا ہے جاگتے ہیں اچانک ـــــ دل میں کبھی کبھی عجیب باتیں۔ یونہی آجاتی ہیں۔

سکینہ بیگم : کون سی بات؟

جمال صاحب: اب ہم کیا بتائیں۔ بس نیند اُچٹ گئی۔ یا شاید ـــــ ہم سوئے ہی نہ تھے۔ یا سو رہے تھے۔ کبھی کبھی سوتے اور جاگنے میں زیادہ فرق نہیں لگتا۔ ذرا دیکھو تو سکینہ بیگم۔ ٹائم پیس تمھارے قریب رکھی ہے۔

سکینہ بیگم : (ٹھہر کر) دو بجے ہیں۔

جمال صاحب: رات کے دو بجے ہیں؟

سکینہ بیگم : اور نہیں تو کیا دن کے؟ (پریشان ہو کر) آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ جمال؟ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟

جمال صاحب: ہاں۔ ایک دم ٹھیک ہے۔ لو، ہم بتی بجھائے دیتے ہیں۔ تم بھی سو جاؤ۔ سو جاؤ۔ (دھیما لہجہ) سو جاؤ۔

[موسیقی کی ایک لہر]

فیڈان :

باورچی خانے میں کھٹ پٹ کی آوازیں

بُوا : (پکارتے ہوئے) منّا، اُو منّا!

مُنّا : ہاں بوا۔ چلاّ کیوں رہی ہو؟ پاس ہی کھڑے ہیں ہم۔

بُوا : تو ہمرا بُلانا چلاّنا ہوئی گیا؟ ارے آنکھ اوجھل، پہاڑ اوجھل، ہم کا جانیں تم کہاں ہو؟ دروجے سے چپکے کھڑے ہو کہ آنگن میں ہو۔ جرا سا پکار لینا ایسی کون سی بات ہے جو تم بُرا مان گیو۔

مُنّا : بُرا کون مان گیا بُوا۔ آکھر ہم نے کون سی بات کہہ دی۔ تم تو ناحک تبنگڑ بنائے لیتی ہو جرا سی بات کا۔ اب ہم اپنا ہونٹے سی لیں گے۔

بُوا : ہائے ہائے ـــــ ارے چھوکرے تیری مت تو نہیں ماری گئی؟ ہونٹے سی لیویں گے۔ ناک پر گصّہ دھرا رہوئے ہے۔ جرا سا مُنّہ کھولو تو گجب ہوئی جائے۔ لیو! اب ہم تم سے باتے نہیں کریں گے۔

مُنّا : (ہنستا ہے) دیکھو بُوا۔ تم ای کہو کہ دانہ پانی چھوڑ دیو گی تو ہم مان لیں۔ پُن ای کہ تم باتے نہ کرو گی، ہم تو مان سکتے نہیں۔ تم اور ہونٹ سی لیو! ای ہوئے نہیں سکتا۔ سمجھیں!

[پاس آتی ہوئی پیروں کی چاپ]

سکینہ بیگم (جھنجھلایا ہوا لہجہ) قیامت ہے۔ کب سے پکار رہی ہے۔ مگر تم دونوں تو کج بحثی میں الجھے ہوئے ہو۔ پھر بھلا سنتا کون!

بُوا : اؤ اصل میں ایسا ہوا کہ۔

سکینہ بیگم : ایسا ویسا کچھ نہیں۔ یہ بتاؤ انڈے کا خاگینہ بن گیا۔ اور پراٹھے۔

بُوا : پراٹھے بن گئے ہیں۔ پَر ای مُنّا ابھی انڈے لایا ہی نہیں۔ ہم ہئو کا کہتے۔ مُنّا جرا لپک کر انڈے تو لے آئیو۔

[مُنّا جاتا ہے]

سکینہ بیگم : ہم مُنّہ دھوئے لیں ذرا۔ خیال رکھنا۔ جمال اُٹھ گئے ہیں۔ اب اخبار کی طلب لگ رہی ہو گی۔ جیسے ہی ریحان اخبار لائیں، بھجوا دینا مُنّا سے سمجھیں!

[سکینہ بیگم جاتی ہیں]

بُوا : (اپنے آپ سے) ہونہہ! دنیا جہاں کی پھکر سب کو ہے۔ ہمری پھکر کسی کو نہیں۔ اکھبار میں سات سمندر کی بات پڑھ لیو۔ سب جان لیو، کہاں، کا، ہُوا؟ پر آدمی کے اندر جو آندھی طوپھان مچا ہوا ہے اؤ کا پتا پاس والے کو بھی نہیں ـــ کوئو کو نہیں!

فیڈ ان

[موسیقی کی لہر ـــــ] فیڈ آؤٹ

پس منظر بدلتا ہے ــــــ

دور سے گٹار پر مغربی دھن۔ کوئی لہک لہک کر گاتا جاتا ہے۔

This little guiding light of mine

I'm going to let it shine! [ہوا کے ساتھ پتّوں کا شور۔ گانے والے کی آواز اس شور کے پس منظر میں کبھی ابھرتی ہے، کبھی ڈوب جاتی ہے۔]

زرینہ : سلیم!

سلیم : کیا ہے زرینہ۔

زرینہ : سُن رہے ہو ـــــ؟ وہی دیوانہ لڑکا گا رہا ہے۔

سلیم : ہاں سُن تو رہا ہوں۔ روز ہی گاتا ہے وہ!

زرینہ : شہر کے ہنگاموں سے دور، کیسی اچھی لگتی ہے اُس کی آواز۔ آس پاس کے کام بوڑھے بوڑھیاں روز کی طرح پارک کی بنچوں پر آ جمے ہوں گے۔ اور گیت سن رہے ہوں گے۔

سلیم : (کچھ سوچتے ہوئے) کیا کریں۔ بے چارے خالی لوگ۔ مصروف زندگی کی حدیں پیچھے چھوڑ آئے۔ اب انھیں کرنا ہی کیا ہے؟

زرینہ : روز اس وقت مجھے ابّی یاد آجاتے ہیں۔ اور امّی بھی۔ ہم بھی بلا وجہ کہاں آ پھنسے!

سلیم : کیا مطلب؟

زرینہ : ارے اپنے ملک میں ہوتے۔ اپنے شہر میں۔ اپنے محلّے میں۔ اپنے گھر میں۔ یہاں سب کچھ کتنا اجنبی، کتنا پرایا سا لگتا ہے۔

سلیم : تو، تمھارا مطلب ہے ہم امریکہ سے واپس ہندستان لوٹ چلیں۔

زرینہ : میں یہ تو نہیں کہتی۔

سلیم : پھر کیا؟ تم روز یاد کرتی ہو اس شہر کو، بستی کو، اُس گھر کو۔ امّی اور ابّی کو۔ اور بوا کی بڑبڑاہٹیں۔

زرینہ : مگر ـــــ ٹھیک ہے ـــــ واپسی اتنی آسان نہیں ہوتی۔ میں نے تو کبھی،

کسی کو، کہیں واپس جاتے دیکھا نہیں۔ سب آگے بڑھتے جاتے ہیں۔

سلیم: (ہنس کر) جو لمحہ گزر جائے، ٹھہر جاتا ہے۔ پتھر بن جاتا ہے۔ بے جان۔

زرینہ: اب بے جان تو مت کہو اُسے۔

سلیم: کیوں؟

زرینہ: امی اور ابی اور بُوا ـــ یاد کرو۔ وہ ہمیشہ گئے دنوں کی باتیں کرتے ہیں۔

سلیم: اس لیے کہ آنے والے دنوں میں اُن کے لیے اب کچھ نہیں۔ وہ اکیلے لوگ ہیں۔ ایک تھکا دینے والے روٹین (ROUTINE) کے شکار۔

زرینہ: روٹین؟ اور یہ سب ـــ؟ یہ شور شرابہ۔ بھاگ دوڑ ـــ آٹھوں پہر کی یہ مصروفیت۔ یہ ہانپتا ہوا شہر ـــ یہ سب روٹین نہیں۔

سلیم: مگر ہم تو اس شہر سے دور SUBURB میں پڑے ہوئے ہیں۔ شہر جاتے ہیں۔ اپنا کام ختم کر کے واپس آجاتے ہیں۔ ٹی وی دیکھتے ہیں۔ روز صبح اس دیوانے گٹاریے کا گیت سنتے ہیں۔

زرینہ: یہ بھی روٹین ہے۔

سلیم: مگر دن بھر شکاگو میں ایک پل کے لیے بھی کچھ اور سوچنے کی مہلت نہیں۔ بس کام کام کام ـــ یہی تو فرق ہے مشرق اور مغرب میں۔

زرینہ: مشرق اور مغرب۔

سلیم: ہاں ـــ مشرق میں روز ـــ سورج نکلتا ہے۔ پھر ڈوب جاتا ہے۔ اور دن کو بھی دنیا کیسی سوئی سوئی سی لگتی ہے؟ میں تو ہفتے بھر میں تھک جاتا ہوں وہاں۔

زرینہ: تھک جاتے ہو؟

سلیم: ہاں ـــ بیٹھے بیٹھے۔ ابی اور امی سے کتنی دیر باتیں کی جائیں۔ اور وہاں باہر بھی کیا ہے؟ کوئی نئی بات نہیں! آدمی کو مصروفیت جس طرح تھکاتی ہے۔ اُسی طرح خالی پن بھی تھکا دیتا ہے۔ یہ تمام بوڑھے اور بوڑھیاں ـــ جو اس وقت گٹار پر دُھن سننے میں مگن ہیں۔ دراصل تھکے ہوئے لوگ ہیں۔ ستاتے ستاتے تھک گئے ہیں۔

فیڈ آن:

[گٹار پر وہی دھن۔ گیت ــــ]

فیڈ آوٹ

جمال صاحب: (پکارتے ہوتے) مُنّا ـــ او مُنّا۔
سکینہ بیگم : کاہے کو پکار رہے ہیں آپ اُسے۔
جمال صاحب: وہ اخبار ـــ
سکینہ بیگم : اخبار آیا ہوتا تو وہ دے جاتا۔
جمال صاحب: (ہنس کر) صبح کا پہلا اخبار تو اپنا مُنّا ہی ہے۔
سکینہ بیگم : آئیں ؟ صبح کا پہلا اخبار۔
جمال صاحب: مُنّا نکڑ والی دکان سے انڈے لینے گیا ہوگا نا۔ اُس نے روداد نہیں سُنائی ابھی تک ہیں؟
سکینہ بیگم : کیسی روداد ؟
جمال صاحب: یہی تو تم سمجھتیں نہیں سکینہ بیگم ـــ ہمارے گھر کے دروازے سے گلی کے نکڑ تک ـ ایک پوری دنیا پھیلی ہوئی ہے۔
سکینہ بیگم : دو سو قدم کے اندر ـــ کیوں ؟ اِس ذرا سی گلی میں جہاں مشکل سے بیس گھر ہوں گے اور دو تین دکانیں ۔۔۔
جمال صاحب: ہاں سکینہ بیگم ـــ ایک پوری دنیا پھیلی ہوئی ہے اتنی سی دوری میں۔
سکینہ بیگم : اور ہزاروں میل دور کی وہ دنیا جہاں ـــ (رک جاتی ہیں)۔
جمال صاحب: جہاں زرینہ ہے ـــ سلیم ہیں ـــ ہمارے بچّے ـــ ٹھیک ہے۔ وہ بھی ایک دنیا ہے۔ ہماری دنیا سے الگ ایک اور طرح کی دنیا۔ مگر امریکہ میں ہمارے بچّے نوکری کرتے ہیں بس۔ اپنے آقا تو نہیں ہیں۔ یاد کرو۔ زرینہ پچھلی بار آئی تھی تو کیا کہتی تھی ؟
سکینہ بیگم : کیا کہتی تھی ؟
جمال صاحب: کہتی تھی صبح سے شام تک ـــ سوائے WEEKEND کے ایک سے دن۔ ایک ایک پل کی مصروفیت ـــ بھاگ دوڑ سے بھرے ہوتے۔ جیسے سب خواب میں ہوں۔ انھیں اپنا خیال بھی نہیں رہتا۔

سکینہ بیگم: مگر — جمال! (چپ ہو جاتی ہیں۔)
جمال صاحب: ہاں ہاں، کہو کہو۔ رک کیوں گئیں۔
سکینہ بیگم: ہمارے بچّے خوش تو ہیں اس دنیا میں۔ آرام کی زندگی گزار رہے ہیں۔ آخر نعیم وہاں ہمیشہ کے لیے جا بسے۔ کوئی تکلیف ہوتی تو لوٹ نہ آئے ہوتے۔
جمال صاحب: لوٹ آتے؟ کیسے لوٹ آتے؟ اس دنیا میں واپسی کے سفر کا کوئی راستہ نہیں!
سکینہ بیگم: ہمارے بچّے سال کے سال آتے نہیں ہمارے پاس؟
جمال صاحب: (اکتائے ہوئے لہجہ میں) ہاں آں ں ں۔ آجاتے ہیں۔ آجاتے ہیں، پھر چلے جانے کے لیے۔ یہ بھی کوئی واپسی کا سفر ہے؟
سکینہ بیگم: آپ جانے کیسی بات کرتے ہیں۔ میرا جی ڈوبنے لگتا ہے کبھی کبھی۔
جمال صاحب: نعیم میاں وہیں کے ہو رہے۔ اچھّن بھائی کے داماد کو جرمنی کے ایک دور افتادہ قصبے میں نوکری ملی تھی۔ وہیں کا ہو رہا۔ عمرو سکانسن میں ہے۔ افتخار میاں لندن میں۔ اختر ریاض ہیں۔ نسیم مسقط میں۔ عزیز ٹوکیو میں۔ ثریّا کو اب پیرس کے علاوہ کوئی شہر اچھّا نہیں لگتا۔
سکینہ بیگم: اس میں ہرج بھی کیا ہے؟ ٹھیک ہے۔ رضوان بھائی کا بیٹا بمبئی چلا گیا۔ جمیلہ آپا بیٹی کے ساتھ حیدرآباد میں ہیں۔ خلیل بنگلور میں۔ ظفر کلکتے میں۔ خاندان اور جان پہچان کے کتنے لڑکے گھر چھوڑ کر ادھر اُدھر چلے گئے۔ آخر فرق بھی کیا ہے لندن اور شکاگو اور بمبئی اور بنگلور میں۔
جمال صاحب: (سوچتے ہوئے) ہاں! تم شاید ٹھیک ہی کہتی ہو۔ کوئی فرق نہیں۔
سکینہ بیگم: پھر آپ پریشان کاہے کو ہوتے ہیں؟
جمال صاحب: ہم اپنے لیے نہیں — اپنے بچّوں کے لیے پریشان ہوتے ہیں۔ سکینہ بیگم۔ مگر یہ بھی بس ایک وہم ہے۔ کوئی کسی اور کے لیے پریشان ہو ہی نہیں سکتا۔ پریشانی اپنی ہو یا دوسرے کی، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایسی ہر بات ہمارے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی جب تک کہ ہم اسے اپنی ہستی کے حوالے سے نہ دیکھیں۔
سکینہ بیگم: اپنی ہستی کا حوالہ؟

جمال صاحب: ہاں ـــــ یہی تو ہماری آنکھ ہے۔ اسی سے ہم اپنے آپ کو، اپنے پڑوسیوں کو، اپنے بچّوں کو، عزیزوں کو، اجنبیوں کو، سب کو دیکھتے ہیں۔ اسی آنکھ سے ہم اپنے گھر کو، اپنی بستی کو دیکھتے ہیں۔ اور ہزاروں میل دور بسے اُس گھر کو جو ہمارے لیے اجنبی ہے۔ مگر جس کی دیواروں میں ہماری اپنی دنیا کا ایک علاقہ بسا ہوا ہے۔

سکینہ بیگم: (ٹھہر ٹھہر کر) آپ شاید بہت یاد کر رہے ہیں۔

جمال صاحب: کس کو؟

سکینہ بیگم: زرینہ کو۔ سلیم کو۔

جمال صاحب: (اداسی سے ہنس کر) بس۔ اتنا ہی؟

سکینہ بیگم: اور ـــــ اور کسے؟

جمال صاحب: یاد کرو ـــــ زرینہ کا بچپن۔ جب اُس نے پہلا جملہ بولنا سیکھا تھا۔ پھر ہم اُسے جب پہلی بار اسکول لے گئے تھے۔ اور زرینہ کا بھی بس ایک ہی چہرہ تو نہیں۔ سال بھر کی زرینہ، دو سال کی زرینہ۔ پانچ سال کی زرینہ۔ یاد ہے اُس کی پانچویں سالگرہ پر ثمینہ اُس کے لیے جو کھلونا۔۔۔

سکینہ بیگم: ہاں ـــــ کتنی لڑائی ہوئی تھی اُس روز راکھی میں اور ثمینہ میں اور بات کتنی ذرا سی تھی؟

جمال صاحب: اور انجلی ـــــ دیپا ـــــ آشی ـــــ رادھیکا ـــــ جویریہ ـــــ کتنی پیاری بچّیاں تھیں۔ زرینہ کے ساتھ کی ساری بچّیاں ـــــ یاد ہے۔ شاید سترہویں سالگرہ تھی زرینہ کی۔ ارے جب اُس نے آنرز کے پہلے سال میں داخلہ لیا تھا کیسے تماشے کیے تھے اُن سبھوں نے۔ فینسی ڈریس۔ گانے ـــــ شرارتیں طرح طرح کی۔

[ستار پر ایک تیز نشاطیہ گت]

فیڈ آؤٹ

فیڈ ان:

[رات کا سناٹا۔ ہوا کا شور]

سلیم: (جمائی لے کر) زرینہ!

زرینہ: (کھوئی کھوئی سی) اوں ہوں ں ں ں۔

سلیم : اب لائٹ آف بھی کرو ! دو بج رہے ہیں۔
زرینہ : بس آخری صفحہ۔
سلیم : کس کا آخری صفحہ۔
زرینہ : ابّی کے خط کا۔
سلیم : صبح پڑھ لینا۔ سو جائیں اب۔
زرینہ : صبح ؟ صبح وقت کہاں ملتا ہے۔ ہم دونوں کو اپنے اپنے کام پر پہنچنے کی جلدی۔
سلیم : پھر باقی کل رات کو سہی۔ کل رات کو بھی نہیں تو اگلے WEEKEND پر اطمینان سے پڑھ لینا۔

[زرینہ کی کھنکتی ہوئی ہنسی]

سلیم : کیا ہوا ؟
زرینہ : ابّی نے وہ وقار چچا کے بارے میں لکھا ہے۔ اور جوشی انکل شرف الدین صاحب۔ رجّن ماموں ! خط کیا ہے پوری داستان ہے۔ (پڑھنے لگتی ہے) "پچھلے اتوار کو بہت دنوں بعد جوشی سے ملاقات ہوئی۔
جمال صاحب : (دور سے آتی ہوئی آواز ــــ پڑھنے کا تاثر) وہ اسی روز جکارتا سے واپس آیا تھا۔ اُس کے بچّوں میں اب سبھی اِدھر اُدھر جا بسے ہیں۔ اُنو، مُنو، تنُو وہ تنُو کی بیٹی کے لیے ایک عجیب و غریب گڑیا لے آیا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ میں بھی اُسے دیکھ لوں۔ سو، وہ گڑیا کو لے کر صبح صبح آن وارد ہوا۔ تمھیں تو یاد ہی ہوگا کہ ہم جب بھی ملتے تھے، صبح کو ناشتے کے وقت ملتے تھے۔ میں اُس کے گھر چلا جاتا تھا۔ یا پھر وہ میرے گھر آجاتا تھا۔ تو اس روز، بہت دنوں بعد، پہلے اس کا فون آیا۔ پھر وہ خود۔ اور اس کے ساتھ ایک گڑیا ــــ تمھاری امّی کو ہنسی آگئی یہ دیکھ کر کہ ہمارے پاس وہ ایک ننھی مُنّی سی گڑیا لیے چلا آرہا ہے۔ ہاں تو اُس گڑیا کی قمیض میں دو بٹن لگے ہوئے تھے۔ اصل میں یہ بٹن نہیں، سوئچ تھی۔ دونوں کو الگ الگ دباؤ تو گڑیا دو الگ الگ گیت گاتی تھی۔ اور اسے اتفاق کہیں یا کچھ اور ــــ کہ وہ دونوں گیت بچپن میں تم بھی گایا کرتی تھیں۔ ایک تو وہ تھا JACK AND JILL WENT UP THE HILL TO FETCH A PILL OF WATER

اور دوسرا وہ JHONEY JHONEY YES PAPA ۔ تو ہوا یہ کہ تمھاری امّی اور میں۔
ہم دونوں بار بار اُس گڑیا کے بٹن دباتے رہے اور یہ گیت سنتے رہے۔ کیسی طاقت
تھی ان گیتوں میں؛ وقت کے دھارے کا رُخ ہی ان گیتوں نے بدل دیا۔ جوشی یہ
سمجھا کہ ہم دونوں سنک گئے ہیں۔ کچھ دیر بعد اُس نے وہ گڑیا تمھاری امّی کو
نذر کر دی اور ہنستا ہوا واپس چلا گیا۔ اب وہ گڑیا ہمارے پاس ہے۔

[جمال صاحب کا قہقہہ ۔ موسیقی کی گت]

فیڈ آوٹ

فیڈ ان :

[زرینہ کی سسکیاں]

سلیم : (حیرت سے) کیا بات ہے زرینہ؟ تم رو رہی ہو!
زرینہ : نہیں تو ــــ (بناوٹی ہنسی کے ساتھ) رو کہاں رہی ہوں میں سلیم!
سلیم : چھوٹی لڑکی ۔ تم رو رہی تھیں ابھی !

[زرینہ چپ رہتی ہے ۔]

سلیم : اب میں لائٹ آف کرتا ہوں۔ سو جاؤ ۔ سو جاؤ۔
زرینہ : (دھیرے سے) پتا نہیں ابّی اور امّی جاگ رہے ہوں گے، کہ سو رہے ہوں گے !
ابّی کو بہت دنوں سے کچّی نیند آتی ہے۔
سلیم : کیوں ؟
زرینہ : خواب بہت دیکھنے لگے تھے ۔ کہتے تھے خواب دیکھتے دیکھتے آنکھیں تھک جاتی ہیں
سلیم : اور جاگتے جاگتے۔
زرینہ : جاگتے جاگتے بھی آنکھیں تھک جاتی ہیں۔ آنکھیں کھلی رہیں یا بند رہیں ــ مشکل
دونوں میں ہے۔
سلیم : اچھا! بس ۔ بہت ہو چکا۔ ابّی اور امّی دونوں مزے میں ہیں۔ کتنا اچھا خط لکھا
ہے انھوں نے۔ پھر تمھیں فکر کس بات کی ہے؟
زرینہ : کتنے اکیلے ہو گئے ہیں ابّی اور امّی !
سلیم : اکیلے ؟

زرینہ: ہاں! ایک دم اکیلے ـــ کیوں نہ ایسا کریں کہ انھیں کچھ دنوں کے لیے یہاں بلالیں۔

سلیم: یہاں؟ یعنی کہ یہاں؟ اسٹیٹس STATES ـــــ

زرینہ: ہاں!

سلیم: مگر یہاں ان کا دل لگے گا؟ ـــ کہیں ایسا نہ ہو کہ ـــ (کچھ کہتے کہتے رک جاتا ہے۔)

زرینہ: کہو! رک کیوں گئے سلیم۔

سلیم: تم دیکھتی ہو اُن اکتائے ہوئے، آپ اپنا بوجھ بنے ہوئے سن رسیدہ مردوں اور عورتوں کو ـــ ہوم HOME میں پڑے رہتے ہیں۔ صبح شام ذرا دیر کے لیے پارک میں جمع ہو گئے۔ اس دیوانے گٹار یے کے گرد۔ شاید ہی کبھی کوئی اُن سے ملنے آتا ہو۔ کتنے اکیلے دکھائی دیتے ہیں یہ لوگ۔ جزیروں کی طرح۔ اندھی ہوا کے تھپیڑے کھاتے، بھٹکتے منڈلاتے پتّوں کی طرح۔ بھولے بسرے گیتوں کی طرح ـــ اب انھیں کوئی نہیں دوہراتا۔

زرینہ: (کانپتی ہوئی آواز میں) سلیم!

سلیم: آپس میں یہ کبھی نہ کبھی اپنے بیٹوں، بیٹیوں کی باتیں تو کرتے ہوں گے۔

زرینہ: سلیم!

سلیم: پتا نہیں اُن بیٹوں اور بیٹیوں کو بھی کبھی ان کا خیال آتا ہو گا کہ نہیں!

زرینہ: (چیخ پڑتی ہے) سلیم۔

[ہیجان خیز موسیقی کی ایک لمبی لہر]

(دروازے پر دستک)

جمال صاحب: (اندر سے) کون؟

مُنّا: ای ہم ہیں ـــ مُنّا!

جمال صاحب: کون؟ مُنّا؟

مُنّا: ہاں!

سکینہ بیگم: آجاؤ اندر۔

[دروازہ کھلتا ہے]

سکینہ بیگم: بوا کیا کر رہی ہیں؟

مُنّا: ناشتہ بنا رہی ہیں۔

جمال صاحب: اخبار آگیا۔

مُنّا: وہی تو لائے ہیں ہم۔

جمال صاحب: اور کیا خبریں ہیں۔ ہمارے شہر کی۔ محلّے کی۔

سکینہ بیگم: اونہہ — آپ کو بھی ہر روز صبح صبح یہ کیا عادت پڑگئی ہے جمال۔

جمال صاحب: (ہنس کر) باہر کی دنیا سے ہمارا رشتہ اسی مُنّا کے واسطے سے تو بنا ہوا ہے۔

مُنّا: ننھّو کی بہو لوٹ آئی۔

جمال صاحب: لوٹ آئی نا؛ ہم تو پہلے ہی کہتے تھے۔ مگر اس ننھّو کو بھی بیٹے بہو کے معاملے میں نہیں پڑنا چاہیے۔ خیر — اور ستار کے بیٹے کا کیا ہوا؛ پاس ہوگیا۔

مُنّا: پاس ہوئی گیا۔

جمال صاحب: اُس سے کہنا ہم سے مل لے۔ ہم انعام دیں گے اُسے۔

مُنّا: اور اُو جَون چوری ہوئی رہی لالہ جی کے ہُواں —!

جمال صاحب (سوالیہ انداز میں) ہاں ہاں؛

مُنّا: پکڑ لیے گئے چور۔

جمال صاحب: پکڑ لیے گئے — کیا؛

مُنّا: ارے کَونُو باہر کے تو رہے نہیں۔ ہم تو پہلے سے کہت رہیں کہ اِی کَونُو گھرے والے کا کام ہوئی ہے۔

جمال صاحب: تو کون تھا؛

مُنّا: لالہ جی کی اپنی بھوجائی اور بھائی — پولیس آئے کے ڈانٹ لگائس توسب کَبول دیہن!

سکینہ بیگم: اچھّا اب تم جا کر ناشتہ لگواؤ! بوا سے کہہ دو ہم آرہے ہیں۔

[مُنّا باہر جاتا ہے۔]

[دور کال بیل بجتی ہے۔]

سکینہ بیگم: کون آگیا صبح صبح ۔۔۔؟

جمال صاحب: (پکارتے ہوئے) مُنّا ۔۔۔ او مُنّا!

مُنّا: (دور سے) آئے رہے ہیں صاحیب ۔۔۔ (آتا ہے)

(آتا ہے۔)

مُنّا: ای لیو!

جمال صاحب: کیا ہے؟

مُنّا: جبرینہ باجی کا کھت۔

سکینہ بیگم: زرینہ کا خط ۔۔۔؟ کون لایا ہے؟

مُنّا: اُو ایشار صاحب ہیں نا۔ ایشار وکیل۔ اُنہی کا نوکر لایا ہے۔ کہت رہا کل رات نثار بھیّا امریکہ سے آئے رہیں۔ اُنہی کے ہاتھ جبرینہ باجی ای کھت بھجوائن ہیں! نثار بھیا سام تک آپ کے پاس اہیں!

سکینہ بیگم: (اکتا کر) اچھا اب باقی سب بعد کو پوچھ لیجیے گا۔ زرینہ کا خط تو پڑھ لیں۔

[جمال صاحب لفافہ چاک کرتے ہیں]

جمال صاحب: (پڑھتے ہوئے) ابّی ۔۔۔ آپ اور امّی کتنے اکیلے ہوں گے۔ (رک جاتے ہیں)

[پس منظر سے حزینہ موسیقی]

زرینہ: (دور سے آتی ہوئی آواز۔) ہر وقت ہمیں آپ دونوں کا خیال لگا رہتا ہے۔ سلیم نے یہ طے کیا ہے کہ ہم بہت جلد کچھ دنوں کے لیے آپ دونوں کو یہاں بلالیں۔ آپ دونوں کے سفر کے سلسلے میں ساری کارروائی جلدی ہی پوری کر لی جائے گی۔ پھر ہم ٹکٹ بھیج دیں گے۔ آپ دونوں اب یہاں آنے کی تیاری شروع کر دیجیے۔ ان دنوں یہاں بہت ٹھنڈ ہے۔ دن کو بھی برفیلی ہوائیں چلتی ہیں۔ مگر ہمارے گھر میں دھوپ خوب آتی ہے۔ پاس ہی ایک پارک ہے۔ اور ایک ہوم جہاں آپ دونوں کی عمر کے بہت لوگ رہتے ہیں۔ ایک دم ہوسٹل کے طرح۔ آپ کی اُن سے خوب دوستی ہوجائے گی۔ اور امّی کو بھی یہ جگہ پسند آئے گی۔ گھر سے تھوڑی ہی دور پر شاپنگ سینٹر ہیں امّی کو اپنے ساتھ لے جایا کروں گی۔ اتنا ضرور ہے کہ دن بھر آپ دونوں گھر میں اکیلے رہیں گے۔ مگر اکیلے تو وہاں بھی رہتے ہیں۔ خیر۔ شام سات بجے تک سلیم گھر

آ جاتے ہیں۔ مجھے کوئی آدھا گھنٹہ اور لگ جاتا ہے واپسی میں۔ پھر آپ بوا کے سپرد کر دیجیے گا۔ اور مُنّا بھی سمجھ دار ہے۔ چاہیں تو کچھ دنوں کے لیے الہ آباد سے سرفراز چچا کو۔۔۔ فیڈ آؤٹ

[جمال صاحب کا طویل قہقہہ]

سکینہ بیگم: اس میں ہنسی کی کیا بات ہے؟ لائیے خط ہمیں دیدیجیے۔

جمال صاحب: (ٹھہر کر) اچھا ہمی پڑھے دیتے ہیں۔ مگر ہماری بیٹی بھی ابھی تک ایک دم بدھو ہے۔ لکھتی ہے۔

زرینہ: (دور سے آتی ہوئی آواز) الہ آباد سے سرفراز چچا کو بلوا لیجیے۔ وہ بھی جگہ بدلنے سے خوش ہوں گے۔ اکیلے الہ آباد میں گھبراتے ہوں گے۔ یہاں بوا اور مُنّا کا ساتھ تو رہے گا۔ اور آیئے تو کم سے کم دو مہینے کے لیے ـــــ ہم کو یہ سوچ سوچ کر الجھن رہتی ہے کہ آپ دونوں بہت اکیلے ہیں۔

[پس منظر سے ہیجان خیز موسیقی کی لہر]

سلیم: (دور سے آتی ہوئی آواز) اکیلے ـــــ جزیروں کی طرح۔

[ہیجان خیز موسیقی]

سلیم: (دور سے آتی ہوئی آواز) اکیلے ـــــ اندھی ہوا کے تھپیڑے کھاتے، بھٹکتے منڈلاتے پتّوں کی طرح۔

[ہیجان خیز موسیقی]

سلیم: (دور سے آتی ہوئی آواز) اکیلے ـــــ بھولے ـــــ گیتوں کی طرح۔

[پس منظر سے ہوا کی سنسناہٹ۔ جمال صاحب ہانپنے لگتے ہیں]

سلیم: (دور سے آتی ہوئی آواز) اکیلے ـــــ اکیلے ـــــ اکیلے ـــــ

[جمال صاحب کی تیز تیز سانسیں]

سکینہ بیگم: یہ آپ ہانپ کیوں رہے ہیں؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں!

جمال صاحب: (بڑبڑاتے ہوئے) اکیلے؟ ہم اکیلے ہیں؟

[اچانک ہنسنے لگتے ہیں۔ پس منظر سے ستار پر تیز گت۔ زرینہ کی سسکیاں ابھرتی ہیں۔]

سلیم : کیا ہوا زرینہ ــــ ؟
زرینہ: امّی کا خط آیا ہے۔
سلیم : کیا لکھا ہے ؟
زرینہ: نہ تو امّی آنے پر آمادہ ہیں نہ ابّی۔
سلیم : کیوں؟
زرینہ: لکھا ہے کام بہت ہیں۔ صبح سے شام تک گھرے رہتے ہیں۔
سلیم : کون گھیرے رہتا ہے انھیں۔
زرینہ: یہ لکھا تو نہیں ہے مگر میں سمجھتی ہوں!
سلیم : کون؟
زرینہ: یادیں!
سلیم : کس کی۔
زرینہ: گئے دنوں کی ــــ کھوئے ہوئے چہروں کی ــــ ڈوبتے لمحوں کی ــــ (جذباتی ہوکر) سلیم!
سلیم : (محبت بھرا لہجہ) ایسا کرتے ہیں۔ ہم دونوں خود چلے چلتے ہیں، دو ہفتے کے لیے۔
زرینہ: نہیں!
سلیم : کیوں؟
زرینہ: منع کیا ہے ابّی نے، لکھا ہے۔

[ہوا کا ایک پرشور جھونکا]

جمال صاحب: (دور سے آتی ہوئی آواز) ــــ اور تم لوگ بھی پریشان ہوکر یہاں مت آجانا۔ تم دونوں وہاں رہتے ہوئے بھی ہمارے ساتھ ہو۔ آٹھوں پہر ساتھ ــــ ہر روز ہم دونوں تم دونوں سے کتنی باتیں کرتے ہیں۔ اور ہم کتنے مگن رہتے ہیں۔ اور وقت کتنی سہولت سے گزرتا جاتا ہے ــــ یا ہم گزرتے جاتے ہیں اور وقت ٹھہرا ہوا ہے۔۔۔

[اختتامیہ موسیقی۔ حزنیہ]

فیڈ آوٹ

△△

نیند

کردار :

۱۔ سامیہ	ایک خواب پرست لڑکی
۲۔ عاصم	ایک خواب پرست نوجوان
۳۔ ابّاجی	سامیہ کے والد
۴۔ ناصر میاں	عاصم کے والد
۵۔ سہیلہ	عاصم کی بہن
۶۔ چچی امّی	سہیلہ کی چچی

[ابتدائی موسیقی۔ تیز رفتار اور ڈراؤنی]

فیڈ آؤٹ سے پہلے دور کہیں کسی عورت کی چیخ سنائی دیتی ہے۔ پھر تیز تیز سانسیں ـــ بیچ بیچ میں سامیہ کے کراہنے کی آواز۔

آپاجی : (دروازے کو تھپتھپاتے ہوئے) سامیہ ! بیٹے سامی ـــ سامیہ !

سامیہ : (تیز تیز سانسوں کے درمیان پھنسی پھنسی سی آواز میں) جی ! آپاجی ـــ آپاجی !

آپاجی : (پکارتے ہوئے) بیٹی سامیہ، دروازہ کھولو۔ دروازہ کھولو۔

[سامیہ دروازہ کھولتی ہے]

سامیہ : (بھرائی ہوئی آواز میں) آپاجی، آپاجی !

آپاجی : کیا ہوا بیٹے ـــ ؟ کتنی بار کہا، دروازہ اندر سے مت بند کیا کرو ! تم سوتے میں اکثر ڈر جاتی ہو۔

سامیہ : سوتے میں ؟

آپاجی : ہاں، اور نہیں تو کیا ؟ دروازہ کھول کر سویا کرو !

سامیہ : سویا کروں ؟

آپاجی : افوہ ! ہاں ہاں ہاں، دروازہ کھول کر سویا کرو۔ اندر سے چٹخنی مت لگاؤ۔ تم سوتے میں ڈر جاتی ہو۔

سامیہ : ہم ـــ مگر، میں سوتی کہاں ہوں آپاجی !

آپاجی : یہ اور لو ! تم سو نہیں رہی تھیں ؟ خواب میں ڈری نہیں تھیں ؟ چیخی نہیں تھیں ؟

سامیہ : میں سو نہیں رہی تھی آپاجی۔

آباجی: پھر کیا؟ کیا جاگ رہی تھیں؟
سامیہ: ہاں! جاگ رہی تھی۔
آباجی: اور جاگتے میں چیخ نکل گئی تھی؟
سامیہ: چیخ؟ کس کی چیخ؟ کب؟ کہاں؟
آباجی: تم چیخی تھیں! ابھی چیخی تھیں! اسی کمرے میں چیخی تھیں۔
سامیہ: مگر ــــ (پُرخیال انداز میں) میں تو جاگ رہی تھی۔ جاگ رہی تھی ناں! مجھے نیند آئی ہی نہیں رات کو ــــ میں تو ساری رات نہیں سوئی ــــ کبھی نہیں سوتی!
آباجی: تمھارا دماغ تو نہیں چل گیا ــــ؟ (چمکارتے ہوئے) سامی بیٹے! کل سے تم میرے کمرے میں سوؤ گی۔ اکیلے نہیں سوؤ گی۔ اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو پھر میں رات بھر جاگوں گا اور تمھارے دروازے پر پہرا دوں گا۔
سامیہ: (ڈری ڈری سی ہنسی) آباجی! آپ ناحق گھبرا جاتے ہیں ذرا سی بات پر۔
آباجی: تم اسے ذرا سی بات کہتی ہو؟
سامیہ: اور نہیں تو کیا ــــ؟
آباجی: تو تم چیخی نہیں تھیں؟
سامیہ: نن ــــ نہیں
آباجی: پھر؟ پھر وہ کس کی آواز تھی؟ ہو بہو تمھاری جیسی! میں جاگ رہا تھا۔ اور میں نے اپنے کانوں سے وہ آواز سُنی تھی۔
سامیہ: آپ جاگ رہے تھے؟ کیوں جاگ رہے تھے؟
آباجی: میں تو ہر روز صبح ساڑھے چار بجے تک جاگ اُٹھتا ہوں! آج بھی اُٹھ گیا تھا۔ مُنہ ہاتھ دھو چکا تھا۔ چاے بنا کر پی لی تھی۔ فجر کی نماز پڑھ لی تھی۔
سامیہ: (حیرت سے) ایں! تو کیا صبح ہو گئی ؟
آباجی: ہاں! تمھارے کمرے سے باہر ــــ وہ دیکھو ــــ کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھو۔ اجالا دھیرے دھیرے پھیل رہا ہے۔ پرندے بھی جاگ چکے۔ اور وہ دیکھو ندی کا پانی اُس اجالے میں کیسا چمک رہا ہے۔ ہم، مگر ــــ وہ چیخ کس کی تھی؟
سامیہ: بتاؤں؟

آپاجی: ہاں بتاؤ ــــ!

سامیہ: پانی کی! میرا مطلب ہے ندی کی ــــ! کبھی کبھی پانی کی کوئی لہر اچانک چیخ اٹھتی ہے۔

[پس منظر سے ہوا کا تیز جھونکا۔ پیپل کے پتّوں کا شور۔ پرندوں کے چہچہے۔ موسیقی کی ایک تیز لہر ــــ]

فیڈ آؤٹ

[حقّے کی گڑگڑاہٹ ــ مسلسل ــ]

ناصر میاں: ہاں تو بھائی سعادت حسین؟ سمجھ میں آئی میری بات؟ اگر اب تک نہیں سمجھے تو اب سمجھنے کی کوشش کرو۔ بھائی صاحب کے بعد میں نے کتنا کہا، گھر بسالو، گھر بسا لو، مگر تم نے ایک نہ مانی! پھر میں نے کہا ــــ اکیلے ہی رہنا ہے تو بیٹی کو ہوسٹل میں داخل کرادو، وہاں اپنی ہم جولیوں میں رہے گی۔ بہلی رہے گی۔ عام لڑکیوں کی طرح وقت گزارے گی۔ گھومے پھرے گی۔ گپ شپ کرے گی۔ کھیلے کودے گی۔ مگر تم نے ایک نہ مانی۔ اب نتیجہ سامنے ہے! تم تو ہمیشہ کے سنکی تھے۔ بیٹی بھی سنک گئی ہے۔ اچھا چلو، ایک آخری مشورہ ــــ

آپاجی: کہو کہو! سنے لیتے ہیں! تمھارے ہر مشورے کی طرح، یہ مشورہ بھی اسی قابل ہوگا کہ اسے نہ مانا جائے۔ ناصر میاں! ایک بات یاد رکھو! مشورے جو ہر ایک کو ڈھیروں کے حساب سے دیے جاتے ہیں، وہ اسی لیے کہ مُفت ہاتھ آتے ہیں۔۔۔

ناصر میاں: اوں ہوں، سعادت سُن تو لو! ماننا نہ ماننا تمھارے اختیار میں ہے!

آپاجی: سناؤ، سنے لیتے ہیں۔ جس طرح مشورے دینے والے کا کچھ نہیں جاتا، اسی طرح سننے والے کی گرہ سے بھی کچھ نہیں جاتا۔

ناصر میاں (سنجیدگی سے) دیکھو! تم میری مانو تو سامیہ کو یہاں سے ہٹا دو!

آپاجی: کک؟ کیا مطلب ہے؟

ناصر میاں: ہٹا دو اُسے یہاں سے!

آپاجی: (کانپتی ہوئی آواز میں) کیوں؟

ناصر میاں: کیونکہ یہاں اس کا ایک دشمن رہتا ہے۔

آباجی: (افسردہ لہجے میں) تو میں اپنی بیٹی کا دشمن ہوں؟

ناصر میاں: تم نہیں!

آباجی: پھر کون؟

ناصر میاں: یہ پانی ـــــ ندی میں بہتا ہوا پانی! پتا نہیں کب سے کس منزل کی تلاش میں بھٹکتا ہوا پانی ـــــ! یہ ترل ترل کرتا ہوا، اپنے آپ میں گم ہمارے سامنے سے گزرتا ہوا ـــــ پانی! اسے کسی کی پروا نہیں۔

آباجی: (حیرت سے) تم نہ جانے کیا کہہ رہے ہو ناصر میاں!

ناصر میاں: میں جو کچھ کہہ رہا ہوں سعادت، تم اچھی طرح سمجھتے ہو پر اپنے آپ کو بہلائے رکھنا چاہتے ہو ـــــ بتاؤ، تمھیں بتاؤ! بھابی صاحب بھی کہتی تھیں یا نہیں کہ یہ پانی بہت سنگ دل ہے۔ اور سامیہ بھی یہی کہتی ہے یا نہیں؟ اور میں بھی یہی کہہ رہا ہوں! تم سامیہ کو یہاں سے ہٹادو ـــــ چلو، کچھ دنوں کے لیے ہی سہی۔

آباجی: کہاں بھیج دوں؟

ناصر میاں: ہمارے گھر بھیج دو ـــــ کچھ روز ہمارے گھر رہ لے گی۔ چار لوگوں میں ہنسے بولے گی تو بہلی رہے گی۔ جس گھر میں آدمی نہ ہو اُس میں اور ویرانے میں بھلا کون سا فرق ہے!

آباجی: تو ـــــ میں آدمی نہیں ہوں تمھارے نزدیک!

ناصر میاں: نہیں!

آباجی: پھر ـــــ؟ پھر میں کیا ہوں؟

ناصر میاں: آدمی کی پرچھائیں ـــــ اور سامیہ پرچھائیوں میں رہتے رہتے تنگ آچکی ہے۔ اُسے تم جتنی جلدی ہوسکے یہاں سے ہٹادو! اور کہیں نہیں تو میرے ہی گھر بھیج دو!

آباجی: پوچھوں گا سامیہ سے!

ناصر میاں: پوچھوں گا کا کیا مطلب ہے؟ ابھی بلاکر پوچھ لو۔ تم نہ پوچھنا چاہو تو میں پوچھ لوں۔ پکارو اُسے!

(پکارتے ہوئے) سامی بیٹے ـــــ سامیہ! او سامیہ!

سامیہ: (دور سے) آتی ہوں آباجی! ابھی آتی ہوں!

ناصر میاں: اس سے پہلے کہ وہ آئے، ایک بات کان کھول کر سُن لو۔ اگر سامیہ نے ہاں کردی تو پھر تم اُسے روکو گے نہیں! سمجھے؟ میں اُسے ابھی، اسی وقت اپنے ساتھ لے کر چلا جاؤں گا۔

آپا جی: (بہت دھیرے سے) لے جانا، لے جانا۔ میرا کیا ہے۔ اُس کے بغیر بھی رہ لوں گا۔

[سامیہ کے قدموں کی چاپ — آتی ہے]

آپا جی: سامیہ! بیٹھو بیٹے! دیکھو، تمھارے ناصر چچا کیا کہہ رہے ہیں؟

سامیہ: (بھرائی ہوئی آواز میں) جی ناصر چچا!

آپا جی: میں سعادت سے کہہ رہا تھا کہ دو چار روز کے لیے تمھیں میرے یہاں رہنے کی اجازت دے دیں۔ ان دنوں سہیلہ کی بھی چھٹی ہے۔ اکیلی ہڑدنگ مچاتی پھرتی ہے دن بھر — تمھارے ساتھ رہ کر وہ بھی کچھ سدھر جائے گی۔

سامیہ: (فیصلہ کن انداز میں) نہیں ناصر چچا۔ میں اس گھر کو چھوڑ کر کہیں نہیں رہ سکتی۔

ناصر میاں: کیوں؟

سامیہ: یہاں آپا جی اور اکیلے ہو جائیں گے۔ پھر، مجھے کھڑکی سے بہتے ہوئے پانی کو دیکھتے رہنے کی عادت ہے۔ اُسے دیکھتے دیکھتے وقت اچھا کٹ جاتا ہے۔ کبھی تھم تھم کر بہتا ہوا پانی، کبھی اچھلتا ہوا پانی — کبھی خاموش — کبھی شور مچاتا ہوا۔ پانی بھی ایک دم آدمی جیسا ہے۔

[پس منظر سے ستار پر تیز گت۔ پانی کا شور]

<u>فیڈ آؤٹ</u>

فیڈ ان:

[باورچی خانے کی کھٹ پٹ۔ ہینڈ پمپ چلانے کی آواز دھیرے دھیرے چچی اَمّی کی آواز ابھرتی ہے]

چچی اَمّی: (بڑبڑاتے ہوئے) ہے ہے۔ غضب خدا کا۔ شام سے صبح، صبح سے —— دوپہر ہونے کو آئی، سورج سوا نیزے پر چمک رہا ہے، صاحبزادے سو رہے ہیں۔ اور جاگیں رات رات بھر، موٹی موٹی کتابیں پڑھتے پڑھتے موئی آنکھیں تھک گئیں۔

اتی سی عمر میں عینک چڑھالی۔ کتنا کہا، بیٹا، صبح سویرے فجر تک اٹھ کر ہری دوب پر ٹہلا کرو۔ مگر میری سنتا کون ہے ___ ؟ سہیلہ او سہیلہ (پکارتی ہے)

سہیلہ: (دور سے) جی چچی امی!

چچی امی: ارے وہیں سے چلاّے جا رہی ہو گلا پھاڑ کے۔ ذرا سنو گی بھی؟

سہیلہ: آرہی ہوں۔

[آتی ہے]

چچی امی: ذرا لاٹ صاحب سے کہو کہ ناشتے کا وقت کب کا نکل چکا۔ اب دن کے کھانے کا دسترخوان بچھنے والا ہے۔ اب تو اُٹھ جائیں۔

سہیلہ: کون، عاصم بھائی؟ رات شاید وہ دیر تک جاگتے رہے۔

چچی امی: ارے وہ تو روز ہی ہوتا ہے۔ اللہ نے دن بنایا کام کے لیے۔ رات سونے کے لیے ہے۔ چرند پرند تک چین سے سوتے ہیں رات بھر۔ مگر صاحبزادے ہیں کہ اُن کے دماغ میں یہ موٹی سی بات بھی نہیں آتی۔ پڑھنے لکھنے کا فائدہ کیا جب آدمی کا بچّہ یہ بھی نہ جان سکے کہ کون سا وقت کس کام کے لیے ہے۔ اے میں کہتی ہوں۔ وقت سے سوؤ ـــ وقت سے جاگو ـــ وقت سے کھاؤ ـــ وقت سے پیو ـــ وقت سے گھومو ـــ وقت سے اُٹھو بیٹھو۔

[سہیلہ ہنستی ہے]

چچی امی: ماشاء اللہ کیا تمیز ہے ـــ کیا تہذیب ہے ___ ؟ بوڑھوں کی ہنسی بچے اُڑائیں۔

سہیلہ: (ہنسی ضبط کرتے ہوئے) تو آپ بات کرتے کرتے ایک ہی جگہ سوئی کیوں گھمانے لگتی ہیں؟

چچی امی: بکو مت! جاؤ، جا کر اُٹھا دو اُسے۔ انتڑیاں سوکھ رہی ہوں گی۔ اُٹھے، ناشتہ کرے، چائے پیے ــــ وقت تو دن کے کھانے کا ہے۔ مگر صاحبزادے جب تک ایک کیتلی چائے حلق سے اتار نہ لیں۔ ۔ ۔

[چچی امی کی آواز اچانک پھنستی ہے۔ کھانسنے لگتی ہیں]

چچی امی: (روہانسی آواز میں) جاؤ ـــــ جگاؤ عاصم کو۔ (کھانسی کا دورہ)

(سہیلہ کے قدموں کی چاپ۔ دور ہوتی ہوئی۔)

وقفہ

سہیلہ: عاصم بھائی ـــــ عاعاصم بھائی ـــ اوں ہوں ـــ اُٹھتے کیوں نہیں؟
عاصم: کون؟ سہیلہ؟ ارے ـــ صبح ہوگئی؟
سہیلہ: دو گھنٹے اور پڑے رہے اسی طرح تو شام بھی ہو جائے گی۔ پتا ہے تمھیں اس وقت کیا بج رہا ہے؟
عاصم: (جمائی لیتے ہوئے) کیا بج گئے ؟
سہیلہ: ساڑھے گیارہ! بچی امی مجھ پر بڑبڑا رہی ہیں۔
عاصم: ایں؟ ساڑھے گیارہ؟ تم تو کہہ رہی تھیں شام ہونے والی ہے۔
سہیلہ: تو کیا اسے صبح کہوں؟ ذرا دیر میں سورج ڈھلنے لگے گا۔
عاصم: (ہنس کر) پھر جاڑوں کی رُت آئی
چھوٹے دن اور لمبی رات ـــــ

سہیلہ: کک ـــــ کیا؟
عاصم: ایک دم کوڑھ مغز ہو تم۔ شعر شاعری تمھارے بس کی بات نہیں۔
سہیلہ: ہونہہ ـــــ ہوگا۔ تم میری فکر چھوڑو اور جلدی سے ناشتے کے لیے تیار ہو جاؤ۔
عاصم: آخر ایسی جلدی کیا ہے؟
سہیلہ: وہ آنے والی ہیں ناں!
عاصم: کون؟
سہیلہ: سامیہ باجی۔
عاصم: سامیہ۔ (دھیرے سے) سامیہ۔ کیوں؟ کس لیے؟ تم تو کہہ رہی تھیں انھوں نے آنے سے انکار کر دیا تھا۔
سہیلہ: وہ بھی ذرا جھکّی ہیں ناں! پہلے نہیں مان رہی تھیں۔ مگر ابو بھی پیچھے پڑ گئے۔ سعادت چچا کی سمجھ میں بھی آگئی یہ بات۔ وہ ظاہر نہیں کرتے۔ مگر سامیہ باجی کی طرف سے پریشان رہتے ہیں۔
عاصم: (پُرخیال انداز میں) ہوں! یہ تو اچھا نہیں!
(خاموشی کا وقفہ)

عاصم : یہ تم اس طرح حیرانی سے مجھے گھور کیوں رہی ہو؟ کیا میرے ماتھے پر سینگ نکل آئے ہیں؟

سہیلہ : (ہنستی ہے) ہاں۔ کچھ کچھ نظر تو آرہے ہیں۔ (ایک دم سنجیدہ لہجے میں) تمھیں سعادت چچا کی فکر ہے یا سامیہ باجی کی ۔۔۔؟

عاصم : کیا؟ تم کہنا کیا چاہتی ہو؟

سہیلہ : ابّو کے بارے میں بھی سوچا کبھی؟ کتنے پریشان رہتے ہیں تمھاری طرف سے۔ وہ تو اُن کی عادت ہے ہنسی مذاق کی۔

عاصم : عجیب بات ہے۔

سہیلہ : کون سی بات؟

عاصم : تم نہیں سمجھوگی بنّو! اچھا ہے ایک لحاظ سے کہ تم نہ سمجھو! سُہیلہ، سب کو ایک جیسا نہیں ہونا چاہیے۔

سہیلہ : پہیلیاں نہ بجھاؤ عاصم بھائی۔

عاصم : جو اداس رہتا ہے وہ تو ہے ہی۔ تم کہتی ہو جو اوپر سے ہنستا ہے وہ بھی اُداس ہے۔ ابّو جی، سعادت چچا ۔۔۔ سامیہ ۔۔۔ اُداسی ایک موسم ہے ۔۔۔ ساری انسانی بستیوں پر پھیلتا ہوا، ایک ایک کو اپنے سائے میں سمیٹتا ہوا۔

(دور سے ۔۔۔ دروازے پر زنجیر کھٹکھٹاتے کی آواز۔ دروازہ کھلتا ہے)

فیڈ ان :

ناصر میاں : ارے سہیلہ؟ عاصم ۔۔۔؟

سہیلہ : (زور سے) آئی ابّو! (جاتی ہے)

ناصر میاں : عاصم کہاں ہیں؟ ذرا دیکھو تو، کون آیا ہے!

سہیلہ : ارے ۔۔۔ سامیہ باجی؟ آداب

سامیہ : (دھیرے سے) آداب۔ کیسی ہو سہیلہ تم؟

سہیلہ : ٹھیک ہوں۔

ناصر میاں : اور بھابی بیگم کہاں ہیں؟ اُنھیں بھی بتادو ناں کہ سامیہ آئی ہے۔

سہیلہ : بَبَرچی خانے میں ہیں۔ عاصم بھائی کا ناشتہ بنارہی ہیں۔

ناصر میاں: ناشتہ؟ اس وقت ناشتہ ــــ ؟ کچھ خبر بھی ہے، دن کتنا چڑھ آیا ــــ ؟
(سامیہ سے) سامیہ بیٹی! تم اب یہیں رہو۔ جب تک جی چاہے رہو۔ جی نہ چاہے جب بھی رہو! بھائی سعادت حسین کی فکر چھوڑ دو۔ میں صبح شام ان کی خیر خبر لیتا رہوں گا۔

(چچی امی کھٹ کھٹ کرتی آتی ہیں)

چچی امی: آ گئی، میری بیٹی ــــ سامیہ۔ آؤ تمھیں گلے لگا لوں۔ آنکھیں ترس گئی تھیں تمھیں دیکھنے کو۔

سامیہ: آداب چچی امی؟

چچی امی: جیتی رہو بیٹی ــــ اچھا ہوا تم آ گئیں۔ میں تو کب سے زور دے رہی تھی۔ ناصر میاں پر کہ تمھیں بلا لیں کچھ دنوں کو۔

ناصر میاں: تو میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کر تو دی بھابی بیگم!

چچی امی: ہاں میاں ــــ (افسردہ لہجے میں) وہاں سعادت بھائی اکیلے ــــ یہاں تم اکیلے۔ دُلھن بیگم کے اُٹھتے ہی اس گھر پر بھی جیسے سناٹا چھا گیا۔ عاصم اپنے کمرے میں بند رہتے ہیں۔ ایک سہیلہ کے دم سے ذرا رونق رہتی ہے۔ سُہیلہ نہ ہو تو میرا سانس لینا بھی دو بھر ہو جائے۔

ناصر میاں: آپ۔ آپ بھابی بیگم ــــ آپ بھی تو بہت اکیلی ہیں۔ آپ نے اس گھر کے لیے کتنا کیا ہے؟ کیا کچھ کر رہی ہیں؟ یہ گھر آپ ہی کی وجہ سے تو گھر لگتا ہے بھابی بیگم!

[پس منظر سے حزینہ موسیقی کی ایک لہر]

فیڈ آؤٹ

فیڈ ان:

[شام کا سناٹا۔ دور بجتی ہوئی گھنٹیاں۔ بہتے ہوئے پانی کی ترل ترل۔]

سامیہ: عجیب بات ہے؟ عاصم! سوچو تو کتنا عجیب لگتا ہے۔

عاصم: کچھ بھی عجیب نہیں ہے سامیہ ــــ سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا ہونا چاہیے تھا۔ گئے دنوں میں یہ بستی کتنی خاموش تھی۔ کچّی سڑکوں پر اکّا دکّا راہ گیر ــــ چلتے جاتے لوگ پرچھائیوں جیسے دکھائی دیتے تھے۔ اب شور بہت ہے۔

سامیہ: اندر بھی اور باہر بھی۔ سچ مچ بہت شور ہے۔

عاصم: وقت کا دریا بہتا رہتا ہے۔ اس سمٹی سمٹائی ندی کی طرح، تم جس کی لہریں گنتی رہتی ہو۔ اپنی کھڑکی سے آنکھیں لگائے۔

سامیہ: امی کے انتقال کے بعد سے ابا جی بہت چپ رہنے لگے ہیں۔ اس گھر میں ہر وقت، آٹھوں پہر اُن کی خاموشی گونجتی رہتی ہے۔

عاصم: اور ہمارے گھر میں چچی امی کے بڑبڑانے کی آواز —— اُن کی ڈانٹ ڈپٹ، ایک پل کو بھی چپ ہوتے میں نہیں آتیں —— اور ابو —— ہنستے رہتے ہیں۔ سُہیلہ کو چھیڑتے رہتے ہیں۔ مگر مجھے پتا ہے۔ چچی امی کی لگاتار ڈانٹ ڈپٹ کی طرح، ابو کی ہنسی کا بھی صرف ایک مطلب ہے۔

سامیہ: کیا؟

عاصم: وہی لمبی چُپ —— جس نے سعادت چچا کو گھیر رکھا ہے اور تمھیں گھیر رکھا ہے۔

سامیہ: اور تم؟

عاصم: ہاں، مجھے بھی گھیر رکھا ہے۔

سامیہ: ایسا کیوں ہے عاصم؟

عاصم: ایسا اس لیے ہے کہ ہم خود بھی گھرے رہنا چاہتے ہیں۔ تمھارے ابا جی نے دوسری شادی نہیں کی۔ ہمارے ابو نے بھی ایسا ہی فیصلہ کیا۔ تمھاری خاطر۔ تمھاری اور صرف تمھاری خاطر سعادت چچا کوئی ایسا قدم نہیں اُٹھانا چاہتے تھے۔

سامیہ: اور ناصر چچا!

عاصم: ہاں، ابو کو سُہیلہ کی اور میری فکر تھی۔ وہ تو کہو کہ چچی امی ہمارے گھر آگئیں، بڑے ابا کے انتقال کے بعد، ورنہ شاید ہمارا گھر اور تمھارا گھر دونوں ایک جیسے ہوتے۔

سامیہ: (گھبرا کر) تو کیا یہ دونوں گھر ایک جیسے نہیں ہیں؟

عاصم: (چونک کر) سامیہ!

سامیہ: (کانپتی ہوئی آواز میں) نہیں، نہیں، پہلے تم یہ بتاؤ کہ دونوں گھر کیا ایک سے نہیں ہیں؟

عاصم: سامیہ ——! سامیہ ——! میں تمھارے لیے پریشان ہوں سامیہ!

سامیہ: میرے لیے؟
عاصم: ہاں، صرف تمھارے لیے۔
سامیہ: کیوں؟
عاصم: کیونکہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔
سامیہ: اُف، ایسی باتیں نہ کرو کہ مجھے رونا آجائے۔
عاصم: میں نے آج سے پہلے تمھیں کبھی بتایا نہیں۔ بتادینا چاہتا تھا جب بھی نہیں بتایا۔ تپچھلے بہت برسوں سے، جب سے میں نے تمھیں جانا ہے، میں تم سے محبت کرتا آیا ہوں سامیہ۔
سامیہ: اُف، میرے خدا۔ (رونے لگتی ہے)
عاصم: تم رو رہی ہو؟ سامیہ؟ دیکھو میں کتنا پریشان ہوں تمھارے لیے۔ آج سے نہیں، پچھلے بہت برسوں سے تمھارے لیے پریشان ہوں۔
سامیہ: کس لیے؟
عاصم: اس لیے کہ تم بہت اکیلی ہو۔ سعادت چچا بہت اکیلے ہیں۔ یہ گھر بہت اکیلا ہے۔ یہاں رہتے رہتے تم کو اندازہ نہیں کہ تم اندر ہی اندر کتنی سمٹتی جا رہی ہو — یہ بھی تو سوچو کہ ہماری دنیا ہمارے اندر ہی نہیں باہر بھی ہوتی ہے۔ بستیاں، آبادیاں، شہر اور قصبے اور باغ اور بَن۔

[دروازے پر دستک، دور سے آتی ہوئی آواز]

سامیہ: (چونک کر) آپا جی آگئے شاید۔ (جاتی ہے)
فیڈ ان:

[ملے جُلے قدموں کی چاپ]

آپا جی: تم نے تو ہمیں تھکا دیا سامی! اور عاصم، تم نے بھی نہیں روکا اِسے؟
عاصم: روکا تو تھا۔ بہت روکا تھا۔ سُہیلہ نے اور چچی امی نے اور راکو نے، سب نے روکا تھا۔
آپا جی: پھر؟
عاصم: سامیہ کو یہی ضد تھی کہ شام سے پہلے گھر واپس آجائیں۔

آپاجی: میں تو چار بجے کے قریب اس خیال سے تمھاری طرف گیا تھا کہ ناصر میاں سے مل لوں گا۔ سامیہ سے مل لوں گا۔ گھڑی دو گھڑی وہاں بیٹھوں گا پھر لوٹ آؤں گا۔ مگر وہاں پہنچتے ہی پتا چلا کہ تم سامیہ کو پہنچانے کے لیے نکلے ہو۔ بھابی بیگم نے روکا، ناصر نے روکا ـــ مگر میں اُلٹے پاؤں واپس چل پڑا۔

[خاموشی کا وقفہ ـ پس منظر سے ہوا کا شور اور پانی کی ترل ترل۔ دور کسی پرندے کی چیخ۔]

سامیہ: لگتا ہے اپنے ٹھکانے سے دور تیز ہواؤں میں پھنس گیا ہے۔

آپاجی: کون؟

سامیہ: پرندہ۔

آپاجی: کون سا پرندہ۔

سامیہ: ابھی جس کی چیخ سنائی دی تھی۔

آپاجی: (فکر آمیز انداز میں) سامی بیٹے!

سامیہ: جی آپاجی!

آپاجی: کتنے خوش تھے ناصر میاں جب تم اُن کے ساتھ جانے پر رضامند ہوگئیں۔ کہتے تھے کم سے کم ہفتہ بھر تو تم وہاں رہوگی ہی۔ وہاں سہیلہ ہے، بھابی بیگم ہیں ـــ اور ـــ اور عاصم ہے۔ اور ایک نہ ایک دن تمھیں وہاں جانا ہی ہے۔

سامیہ: (کانپتی ہوئی آواز میں) آپاجی!

آپاجی: مجھے اجازت ہے چچا میاں؟

سامیہ: اوہ ـــ ہاں ـ تم جانا چاہتے ہو عاصم! ٹھیک ہے۔ چائے پینا چاہو تو رکو!

آپاجی: چائے کی خواہش نہیں ہے چچا میاں!

سامیہ: کوئی بات نہیں۔ ٹھیک ہے۔ کل پھر آنا۔

[عاصم چلا جاتا ہے۔ اس کے قدموں کی چاپ دور ہوتی جاتی ہے۔]

آپاجی: یہ تم نے اچھا نہیں کیا سامیہ!

سامیہ: جی آپاجی۔

ابّا جی : تمھیں وہاں رک جانا چاہیے تھا۔ ہفتہ بھر کے لیے نہ سہی، ایک دو روز کے لیے ہی۔

سامیہ : (دھیرے سے) جی !

ابّا جی : میں نے اُس گھر میں جانے سے، عاصم سے ملنے سے، تمھیں کبھی نہیں روکا۔ بھابی بیگم۔ ناصر میاں، سہیلہ، سب کے سب تمھیں کتنا چاہتے ہیں۔ ناصر کب سے زور دے رہے ہیں۔ تاریخ مقرر کرنے کے لیے ـــــ میں نے سوچا تھا، تم بچپن سے اس گھر میں آتی جاتی رہی ہیں۔ عاصم کی امّی کے زمانے تک، تم کتنی بار وہاں جاکر رہی تھیں۔ تمھاری امّی نے بھی کبھی نہیں روکا ـــــ اور تم کتنی خوش رہتی تھیں وہاں ـــــ تو میں ـــــ ناصر میاں سے مل کر تاریخ طے کر لوں۔

سامیہ : (بھرائی ہوئی آواز میں) کیسی تاریخ ؟

ابّا جی : تمھاری اور عاصم کی شادی کی تاریخ ؟

سامیہ : (کانپتی ہوئی آواز میں) ابھی نہیں ـــــ ابھی نہیں ابّا جی !

(سانسیں تیز تیز چلنے لگتی ہیں)

فیڈ ان :

[پس منظر سے ہیجان خیز موسیقی]

فیڈ آؤٹ

عاصم : سامیہ ! اتنا چھوٹا سا خط پہلے کبھی نہیں لکھا تھا۔ شاید آگے بھی نہیں لکھوں گا۔ تم نے ٹھیک ہی فیصلہ کیا۔ اور تم نے ہی تو کہا تھا کہ بیداری اور تنہائی ایک ہی سچ کے دو الگ الگ نام ہیں ! ـــــ دو اکیلے انسان ملنے کے بعد بھی اکیلے ہی رہتے ہیں۔ اکیلا پن تو ایک احساس ہے۔ ایک رویّہ، کوئی کسی کی زندگی میں داخل ہو جائے تو بھی ـــــ اکیلا پن ختم تو نہیں ہو جاتا۔ اکیلے پن کی دیواریں بہت اونچی ہوتی ہیں۔ ٹھیک ہے۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ـــــ عاصم۔

[پس منظر سے تیز رفتار موسیقی کی ایک لہر]

فیڈ ان :

رات کا سنّاٹا۔ ہوا کا شور۔ دور کہیں شیشے کا کوئی برتن ایک چھناکے کے ساتھ

بکھر جاتا ہے۔

فیڈ آؤٹ

(دروازے پر لگاتار دستک)

آباجی : (باہر سے) سامیہ، سامیہ! بیٹے سامی!

[سامیہ اُٹھ کر دروازہ کھولتی ہے]

سامیہ : (ٹھہرے ہوئے لہجے میں) جی آباجی!

آباجی : یہ کیسی آواز تھی؟ تم کچھ پڑھ رہی تھیں؟

سامیہ : جی! (بھرائی ہوئی آواز میں) عاصم کا خط تھا۔

آباجی : خط؟ کیا ہوا؟ مجھے پوری بات بتاؤ!

سامیہ : (ٹھہرے ہوتے پرسکون لہجے میں) ہم دونوں نے اکیلے رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ شادی نہ کرنے کا!

آباجی : (گھبرا کر) تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے سامیہ!

سامیہ : جی!

آباجی : مگر تم تو کہتی تھیں کہ تمھیں عاصم پسند ہے۔

سامیہ : جی!

آباجی : اور عاصم بھی کہتا تھا، یہی کہتا تھا۔ مجھ سے بھابی بیگم نے، ناصر نے، شہیلہ نے، سب نے یہی کہا تھا۔

سامیہ : جی!

آباجی : جی! جی! جی! تم صاف کیوں نہیں بتاتیں؟ تمھیں نیند تو نہیں آرہی ہے؟

سامیہ : نیند ـــــ نیند تو پوری ہوچکی ـــــ کب کی پوری ہوچکی۔

آباجی : پہیلیاں نہ بجھاؤ سامی۔

سامیہ : (خواب ناک لہجے میں) ہم دونوں ہی شاید خواب دیکھ رہے تھے اور نیند میں تھے اور جو کچھ ہوا وہ سب کچھ غیر حقیقی تھا۔

آباجی : سامیہ!

سامیہ : (اسی رَو میں) اور اب نیند ٹوٹ چکی ہے۔ اور میں جاگ رہی ہوں۔ اور اب اُس

خواب کی پرچھائیں بھی باقی نہیں رہی۔ ہم نیند میں ایک دوسرے کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں، جاگتے ہیں تو ہم سب اپنے آپ کو اکیلا پاتے ہیں۔

آپاجی : (ڈرا ڈرا سا لہجہ۔ کپکپاتی آواز) سامیہ !

سامیہ : آپ جائیے آپاجی ! اور سو جائیے ! اور پریشان نہ ہوئیے میری خاطر۔ ــــ اور ناصر چچا سے کہہ دیجیے کہ وہ بھی پریشان نہ ہوں ــــ جائیے ــــ سو جائیے۔ ہوا کا شور بھی اب تھم چکا ہے۔ میں جاگ رہی ہوں، جاگ رہی ہوں !

[دروازہ بند کر لیتی ہے]

پس منظر سے اختتامیہ موسیقی کی ایک تیز گت۔

فیڈ آؤٹ

△△

مطالعے اور تجزیے: جدیدیت کی فلسفیانہ اساس؛ غزل کا نیا منظر نامہ۔ نئی شعری روایت؛ کہانی کے پانچ رنگ؛ اقبال کا حرف تمنا؛ قاری سے مکالمہ۔

ترجمے: ہماری آزادی (مولانا ابوالکلام آزاد)؛ یادوں کا اجالا (بھگوان سنگھ)؛ قومی یک جہتی اور سیکولرزم (ڈاکٹر تاراچند)؛ جدوجہد کے سال (جواہر لال نہرو)؛ شہر خوں آشام (پچاس بنگالی نظمیں)۔

ڈرامے: مٹی کا بلاوا، مجھے گھر یاد آتا ہے، زندگی کی طرف، بازار میں نیند

ترتیب: سیاہ فام ادب؛ سر سید سے اکبر تک؛ فراق شاعر و شخص؛ فراق، دیار شب کا مسافر۔

مصوری: اے رام چندرن: سیاقی سیریز۔